آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے ٭ لو تمہیں طور تسلّی کا بتایا ہم نے

# ریویو آف ریلیجنز

یعنے

## دنیا کے مذاہب پر نظر


جلد ۵ | بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء | نمبر ۷


### فہرست مضامین




قادیان ضلع گورداسپور - ۲۰ - جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کو مینیجر میگزین کے اہتمام سے شائع ہوا چندہ سالانہ عا/

# رؤیا والہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

۱۴-جون ۱۹۰۶ء - واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون۔
۱۶-جون ۱۹۰۶ء- زلزلہ آنیکو ہے۔ ۱۹-جون موعود لڑکے کی نسبت جو میاں منظور محمد کے گھر پیدا ہوگا تین نام اور ظاہر کیے گئے۔ کلمۃ العزیز۔ ناصر الدین۔ فاتح الدین۔ اسی کے متعلق الہام ہوا۔ ھٰذا یوم مبارک۔
ماہ جولائی ۱۹۰۶ء۔ ادعونی استجب لکم۔ انی مع الافواج اتیک بغتۃ۔ رؤیا مبارک احمد خسرہ کی شدت عوارض کی وجہ سے سخت تکلیف میں تھا اور شدت خارش میں اپنے بدن کی بوٹیاں توڑتا تھا۔ اور نیند نہیں آتی تھی اور سخت اضطراب اور گھبراہٹ تھی۔ اسوقت میں نے اسکے لئے دعا کی۔ ابھی میں دعا میں مشغول ہی تھا کہ کشفی حالت مجھ پر طاری ہوگئی اور دیکھا کہ مبارک احمد کے بستر پر چھوٹے چوہوں کی شکل پر بہت سے جانور ہیں اور اسکو کاٹ رہے ہیں تب ایک شخص نے وہ سب جانور بستر پر سے اٹھا کر ایک چادر میں باندھ دیے اور کہا کہ انکو پھینک دو۔ پھر کشفی حالت جاتی رہی اور مَیں نے دیکھا کہ لڑکا آرام میں آگیا اور تکلیف کا نام و نشان نہ رہا اور آرام سے سو گیا اور صحت یاب ہوگیا۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔

# ریویو

**الذکر**۔ یعنی اسمائے الٰہیہ اور نماز کا ترجمہ اور چند نصائح جو احادیث سے لیے گئے ہیں ان کو شیخ عبد الرحیم صاحب نے چند سبقوں میں لکھکر نہایت عمدہ اور موٹے کاغذ پر خوشخط چھپوایا ہے۔ یہ کتاب اسلامی مدرسوں میں داخل کرنیکے لائق ہے اور ویسے بھی ہر ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ پچاس صفحوں کی کتاب ہے اور قیمت صرف ۲ ہے۔ شیخ عبد الرحیم صاحب سے قادیان سے مل سکتی ہے۔

**ستیارتھ پرکاش درپن**۔ مصنفہ مولوی ابو رحمت حسن صاحب میرٹھ۔ ۷۰ صفحے قیمت ۳ر - میرٹھ النذیر پریس سے مل سکتی ہے۔

**خزینۃ المعارف حصہ اوّل و دوم**۔ حکیم فضل دین صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب سے تفسیر قرآن کریم کے حصوں کو الگ کرکے ایک مکمل کتاب کی صورت میں چھاپنا چاہا ہے ان ہر دو حصوں میں تفسیر سورۂ فاتحہ ہے جو براہین احمدیہ و کرامات الصادقین وغیرہ کتب سے لی گئی ہے جہاں حضرت اقدس نے تفسیر عربی میں کی ہے اسکا ترجمہ اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ ۱۱۲ صفحے قیمت ۵ر - حکیم فضلدین صاحب سے قادیان سے مل سکتی ہے۔

**ہندو محمدی اور مسیحی مذہب کا مقابلہ**۔ ۴۴ صفحے کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو یونگ صاحب نے جو مشن کالج الہ آباد کے پرنسپل ہیں لکھا ہے اس میں اسلام کے متعلق چند بے سر و پا باتیں اور عیسائی مذہب کے متعلق چند لغو باتیں پادری صاحب نے لکھی ہیں۔ خدا ان لوگوں کی آنکھیں کھولے کہ وہ صداقت اسلام کو دیکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

# اسلامی قانون وراثت

بہت سے مسائل جن میں سے بعض پر گذشتہ پرچوں میں بھی بحث ہو چکی ہے۔ مثلاً پردہ۔ تعدد ازدواج۔ طلاق غلامی ممانعت سود۔ قانون وراثت۔ وغیرہ مذہب اسلام کے بنیادی مسائل میں داخل نہیں۔ اور نہ ہی ان صفحات میں ان مسائل پر اس غرض سے بحث کی گئی ہے کہ ان سے اسلام کے منجانب اللہ ہونے پر ویسی ہی قطعی شہادت پیدا ہوتی ہے جیسی کہ مسائل توحید ونبوت وغیرہ سے جو مذہب اسلام کے اصل شہتیر ہیں۔ بلکہ اس سلسلہ وار بحث کی جس کا آغاز جنوری ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا ضرورت یہ پیش آئی تھی کہ بعض مسلمان کہلانیوالے لوگوں نے اسلام کے ان مسائل کو قابل اعتراض اور مسلمانوں کی گری ہوئی حالت کی اصل وجہ بیان کیا۔ اور مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ انکی بجائے وہ عیسائی قوموں کے اصول پر چلیں اور کہ مغربی قوموں کے نقش قدم پر چلنے سے ہی وہ پھر دنیا میں اپنی گم گشتہ قوت اور شوکت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ان باطل خیالات کی تردید ہی اس سلسلہ مضامین کا اصل مقصد تھا۔ کسی مذہب کے مخالفوں کا اس مذہب پر اعتراض کرنا تو کوئی نئی بات نہیں مگر اس زمانہ میں طرح طرح کے اثروں سے مؤثر ہو کر بہت سے مذاہب کے اندر بعض ایسی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں جو زمانہ کی نئی ضروریات کے مطابق اس مذہب میں اصلاح کرنیکی دعویدار ہیں۔ اور سوائے اسلام کے دوسرے مذاہب میں ان اندرونی جماعتوں کا حملہ فروع پر نہیں بلکہ اصول مذہب پر ہے۔ مثلاً عیسائی مذہب کے تثلیث اور کفارہ اور الوہیت مسیح کے اصولی عقیدے زیر بحث لا کر تمام دانشمند عیسائی اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ یہ عقائد غلط ہیں۔ اور انہی خیالات کا اظہار انہوں نے بائبل کے انسکلوپیڈیا میں بھی کیا ہے جسکے لکھنے والے عیسائی پروفیسر اور پیشوایان عیسائی مذہب ہیں۔ یہی حالت بعض دیگر مذاہب مثلاً ہندو مذہب وغیرہ کی ہے مگر اسلام کو اسجگہ بھی ایک امتیاز حاصل ہے۔ اور وہ یہ کہ اسکے اصول مثلاً توحید باری تعالیٰ اور نبوت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اندرونی اعتراض نہیں ہیں بلکہ بعض فروعی مسائل پر جنکا ذکر ہم نے اوپر بھی کیا ہے اس قسم کی بحث ہو رہی ہے کہ آیا یہ مسائل نئے زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہیں یا ان میں کوئی تغیر وتبدل ہونا چاہیئے۔ انہی لوگوں کے خیالات پر ہم نے گذشتہ رسالوں میں بحث کی ہے اور انہی کے خیالات پر جو اسلامی قانون وراثت پر انہوں نے ظاہر کئے ہیں اسجگہ بھی میں بحث کرنی چاہتا ہوں مگر میں یہ ضرور کہونگا کہ ان فروعی مسائل پر بحث کرنے میں بھی بہت سے امور صریح صریح ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ جنسے یہ شہادت ملتی ہے کہ اسلام کا سرچشمہ انسانی علم اور طاقت سے برتر ہے۔

قرآن کریم میں مسلمانوں کے لیے نہ صرف اعلیٰ درجہ کی اخلاقی اور مذہبی ہدایات ہی ہیں بلکہ اس کتاب پاک میں اللہ تعالیٰ نے تمدنی اور ملکی قوانین کے بھی ایسے اصول بیان فرما دیے ہیں جن پر چلنے سے مسلمان دین و دنیا کی فلاح حاصل کر سکتے ہیں بعض دوسرے مذاہب میں بھی اس قسم کے اصول دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر وہ اصول ایسے ناقابل عملدرآمد پائے گئے ہیں کہ ان مذاہب کے پیرووں کو انہیں چھوڑ کر خود اپنے لیے اصول تجویز کرنے پڑے ہیں۔ مگر اسلامی اصول کو یہ فخر حاصل ہے کہ اکثر اسلامی رواجوں اور قوانین کی بنیاد قرآن کریم کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ مثلاً حضرت مسیحؑ نے بھی طلاق کے متعلق ایک قانون انجیل میں دیا ہے جس کو عیسائی صاحبان باوجود خدا کا کلام کہنے کے اس کے ایک حرف پر بھی عمل نہیں کرتے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ "میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو زنا کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دیوے اس سے زنا کرواتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے زنا کرتا ہے۔" مگر آج کسقدر عیسائی گورنمنٹیں ہیں جنہوں نے اس قانون طلاق کو صحیح تسلیم کیا ہے؟ کونٹ ٹالسٹائی کے متعلق مندرجہ ذیل واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ کلیسیا کے عہدیدار بھی خود اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ یسوع مسیح کی تعلیم عمل کرنیکے لیے نہیں دیگئی تھی "کونٹ ٹالسٹائی کہتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ پہاڑی وعظ کو روسی کسانوں کے لیے چھپوایا۔ لیکن قبل اسکی اشاعت کے یہ ضروری تھا کہ وہ افسر مطابع کی اجازت حاصل کرے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ایک کاپی اس عہدیدار کو بھیجی گئی جب وہ کاپی واپس آئی تو اس میں سے یہ فقرہ کہ "کل کی فکر نہ کرو" کاٹا ہوا تھا۔ ٹالسٹائی نے اس عہدیدار سے جو پادری تھا اس کی وجہ پوچھی اور لکھا کہ یہ ہدایت تو خود یسوع مسیح کی دی ہوئی اور بائبل کا ایک حصہ ہے اور ایسی ہی مقدس ہے جیسا کہ اس کا کوئی اور حصہ۔ پادری نے جواب دیا کہ بیشک جو تم کہتے ہو وہ سچ ہے مگر بیچارہ زمیندار بائبل کے اس حصہ تک کب پہنچ سکتا ہے بلکہ نوے فیصدی تو ایسے ہیں کہ کتاب پیدائش سے آگے بھی نہیں گذرتے۔ اب تم دیکھ سکتے ہو کہ اگر کسان واقعی اس ہدایت کو صحیح سمجھ لے تو روس کا تو دیوالہ نکل جائیگا۔ کسان بیچارے ایک دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے نہ وہ کچھ پس انداز کرینگے۔ انسے خراج کا وصول کرنا ناممکن ہوگا۔ فوج بھوکی مرجائیگی۔ گورنمنٹ اپنے ملازموں کو تنخواہیں نہیں دے سکی گی۔ اور سخت ابتری کی حالت ملک میں پھیل جاوے گی۔ یقیناً میں اس فقرہ کو کاٹنے کے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔" یہ تو ہے پادری صاحبان کی رائے انجیل کے احکام کے متعلق۔ مگر قرآن کریم کے احکام سب کے سب عمل کے لیے دیئے گئے ہیں۔ اور اس کے ہر قسم کے قوانین خواہ وہ طلاق کے متعلق ہیں یا نکاح کے۔ خواہ وصیت کے متعلق ہوں یا تقسیم ورثہ کے۔ انپر مسلمان دنیا عمل کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اور عموماً اہل اسلام کا انپر اتفاق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی ان قوانین کے خلاف بھی بعض اشخاص نے کوشش کی ہے مگر مسلمانوں میں ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی آجتک کوئی زبردست فرقہ اسلام کے اندر ایسا قایم ہوا ہے جس نے اسلام کے مروجہ قوانین کو جنکی بنیاد قرآن کریم پر ہے مٹا کر انکی بجائے کوئی نئے قوانین قائم کرکے انپر اسلامی دنیا کا عملدرآمد کرا دیا ہو۔ یہ امر مسلمانوں کو دنیا کی تمام قوموں سے ممتاز کرنیوالا ہے کہ ان میں نہ صرف اہم اور اصولی عقاید پر ہی بلکہ تمدن اور معاشرت کے قوانین پر بھی اسقدر اتفاق ہے

جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب کے پیرووں میں نہیں ملتی۔

بعض لوگوں نے جہالت سے یہ کہا ہے کہ مذہب اسلام کوئی ترقی کرنیکے قابل نہیں جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ پرانے رواجوں اور قوانین کو چھوڑ کر نئے قوانین اختیار نہیں کرتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اسلام کے مخالفین۔خواہ وہ اندرونی ہوں یا بیرونی۔ اس کی خوبیوں کو بھی عیب بنا کر دکھانا چاہتے ہیں۔ یہ تو اسلام کی عظیم الشان خوبیوں میں سے ایک بات تھی کہ تیرہ سو سال کے عرصہ کے اندر دور دراز ممالک میں جہاں کی آب و ہوا اور اطوار و اوضاع ایک دوسرے سے بالکل مخالف تھے کروڑہا انسان انہی اصول عقائد اور انہی قوانین پر قایم رہے اور ہیں جو ایک عرب کے رہنے والے اُمّی نے سکھائے تھے حالانکہ دوسرے کسی مذہب میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ دوسرے مذاہب نے اگر کچھ قوانین بنائے بھی تو وہ ایسے تھے کہ ایک خاص قوم کی ایک وقت کے لیے ضرورت کو پورا کرنیوالے تھے اور اسی لیے ان قوانین میں جلدی ہی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی مگر اسلام نے جو اصول اور قوانین مسلمانوں کو سکھائے وہ ہمیشہ کے لیے اور ہر ملک اور قوم کے لیے تھے۔ اور جہاں دوسرے مذاہب کے اصول اکثر حالتوں میں ناقابل عملدرآمد پائے گئے ہیں اسلام کے اصول کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ قابل عملدرآمد ہیں اور اسلامی دنیا کا ابتدائے زمانہ اسلام سے آجتک انپر عمل چلا آتا ہے۔ مثلاً عیسائیوں کا قانون طلاق ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے نہیں تھا اور اسی لئے عیسائیوں کو اس میں تبدیلی کر کے خود ایک قانون تجویز کرنا پڑا۔ اب یہ کسقدر حماقت ہے کہ اس مذہب کو جس کے قوانین اور اصول پر چند دن بھی چند قومیں اتفاق نہیں کر سکیں عالمگیر مذہب کہا جاوے۔ اور اس نقص کو چھپانے کے لیے پادری صاحبان نے یہ تجویز نکالی ہے کہ کہدیتے ہیں کہ عیسائی مذہب ترقی پذیر ہے۔ حالانکہ اگر سوچا جائے تو اس کلام کا مفہوم سوائے اسکے کچھ نہیں کہ یہ ایک ناقص مذہب ہے اور کامل نہیں۔ اور خود حضرت مسیحؑ نے بھی یہی فرمایا تھا۔ برخلاف اس کے اسلام کے اصول اور قوانین کو دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ صدہا سالوں سے ان میں کسی قسم کا تغیّر نہیں آیا کیونکہ وہ ایسی کامل صورت میں دیے گئے ہیں کہ ان میں تغیّر کی ضرورت ہی نہیں۔ نہ صرف مختلف ممالک کے رہنے والے مسلمان ہی ان قوانین اور اصول کو اپنے عملدرآمد میں لائے ہیں۔ بلکہ آخر عیسائی قوموں نے بھی انہی اصول اور قوانین کی طرف اپنا میلان دکھایا ہے۔ چنانچہ جو کچھ طلاق کے متعلق عیسائی قومیں اپنے قوانین میں اصلاح کر رہی ہیں یا تقسیم وراثت کے متعلق جو بہت سی عیسائی قوموں نے پہلو اختیار کیا ہے وہ عین اسلامی ہیں۔ ہاں تعدّد ازواج کے خلاف عیسائی قوموں میں سخت تعصب پایا جاتا ہے۔ اور اس بارے میں وہ دلائل پر بھی غور نہیں کرتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ایک بات فرض کر کے اسپر ضد کر رہے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم نہیں کہ کوئی شخص جب تک تعدد ازدواج کا پابند نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو زوج واحد کے عام قاعدہ کے لیے بطور ایک استثناء کے ہے اور تعدد ازدواج کی ممانعت کا نتیجہ یورپ میں اس خطرناک بدکاری کا پھیلنا ہوا ہے جو انسانوں کو انسانیت کے درجہ سے نیچے گرا رہی ہے۔ یعنی زنا کا پیشہ۔ جب ایک شخص عیسائی بزرگوں کے اس غیظ و غضب کو دیکھتا ہے جو ایک شخص کی

دوسری بیوی کرنے پر وہ ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف انکو سوسائٹی کی اس حالت پر بالکل مطمئن پاتا ہے کہ لاکھوں کسبیاں ان کے درمیان موجود ہیں اور زنا اور اغوا کا بازار گرم ہے۔ تو تعجب ہی آتا ہے۔ حالانکہ ایک موٹی سمجھ کا انسان بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ اگر تعدد ازدواج کی ممانعت کو دور کر دیا جائے تو زناکاری کی کثرت میں بہت کمی ہو سکتی ہے۔ مگر ان دانشمندوں کے نزدیک تعدد ازدواج نکاح اور مرد اور عورت کے تعلقات کے اعلیٰ ترین مفہوم کے منافی ہے خواہ واقعی اس کی کیسی ہی ضرورت ہو۔ مگر زنا اس اعلیٰ مفہوم کا منافی نہیں۔ پنجاب میں گذشتہ مردم شماری کے رو سے صرف ایک فیصدی آدمی اہل اسلام میں ایسا ہے جو دو بیویاں رکھتا ہو مگر اسکو نکاح کے مفہوم پر ایک خطرناک عیب سمجھا جاتا ہے۔ مگر لنڈن میں جہاں معمولی زناکاری کے علاوہ صرف ایک لاکھ کسبیاں ہیں جو کم از کم دس لاکھ مردوں کے وحشیانہ جذبات کا شکار ہو رہی ہیں اور اس طرح پر قریباً پچیس فیصدی آدمی اس کھلی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہیں جو سارے بن بیاہے نہیں ہوتے۔ ہاں لنڈن میں اس خطرناک سیاہ کاری کے باوجود نکاح کے اعلیٰ مفہوم کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اور تعلقات نکاح نہایت پاکیزہ سمجھے جاتے ہیں جسکا مطلب بالفاظ دیگر یہ ہے کہ اگر سو آدمیوں میں سے ایک آدمی مجبوری کے لیے جو اکثر اولاد کی خواہش ہوتی ہے دوسری بیوی کو اپنے نکاح میں لائے تو یہ بہت بُرا ہے بہ نسبت اس کے کہ ہر تین یا چار آدمیوں میں سے ایک آدمی محض جذبات نفسانی کا مطیع ہو کر دوسری عورتوں سے زناکاری کا ارتکاب کرے۔ خدائے تعالیٰ اس قوم کے اخلاقی فہم میں روشنی بخشے کہ ایک ذلیل ترین اور نہایت ہی گری ہوئی حالت کو تعدد ازدواج پر ترجیح دیجاتی ہے۔

جیساکہ میں اوپر کہہ چکا ہوں اسوقت مسلمانوں میں بھی وہ لوگ موجود ہیں جو بعض اسلامی قوانین اور رواجوں کو غیر معقول کہتے ہیں اور انکو ہدف اعتراضات بناتے ہیں اور انکو ان قوانین اور رواجوں سے بدلنا چاہتے ہیں جو مغربی اقوام میں پائے جاتے ہیں اور جن سے خود وہ اقوام نفرت کر رہی ہیں یا انکی غلطی کو محسوس کرنے لگی ہیں۔ اس مضمون میں میں اس قسم کے لوگوں کے ان اعتراضات پر بحث کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے اسلام کے قانون وراثت پر کیے ہیں۔ قانون وراثت اسلام کا کوئی بنیادی اصل نہیں۔ اور جو لوگ اس اصلاح کے مدعی ہوتے ہیں خود انکی تعداد اسقدر کم ہے کہ وہ چنداں قابل التفات نہیں ہیں۔ مگر چونکہ مغربی تہذیب کے دلدادہ روز بروز ترقی کر رہے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اُنکی غلطی پر آگاہ کیا جائے۔ مغربی تہذیب کے مداحوں نے جہاں اور بہت سے نئے نئے رواج اختیار کر رکھے ہیں یہ بھی اپنا وطیرہ بنا لیا ہے کہ اسلامی اصول کو ہی مسلمانوں کے موجودہ تنزل اور افلاس کی حالت کی اصل وجہ بیان کیا جائے۔ یہ لوگ جو مسلمانوں کے ہادی اور مصلح ہونیکے دعویدار ہیں اس بیماری کی تشخیص کرنے میں جو اس وقت اہل اسلام کو لگی ہوئی ہے اسقدر جلد بازی سے کام لیتے ہیں کہ وہ ایک لمحہ بھر یہ غور کرنیکے لیے بھی نہیں ٹھہرتے کہ آخر یہی اصول جنپر یہ عیب لگایا جاتا ہے کسی زمانہ میں مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا حقیقی گر تھے۔ اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ایک وہ زمانہ تھا جب اسلامی تہذیب کی مشعل اپنے بلند مینار سے ساری دنیا کو روشن کر رہی تھی اور مسلمان سب دنیا کی قوموں سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ مگر اسوقت

وہ انہی قوانین اور رواجوں کے پابند تھے۔ جنکو آج انکے زوال کا باعث بتایا جاتا ہے اب یہ تو ناممکن ہے۔ اور سمجھ نہیں آسکتا کہ جن اصول اور قوانین وضوابط پر چلکر ایک وقت ایک قوم قعرِ ذلت سے نکلکر اوج ترقی اور تہذیب پر پہونچی ہو۔ انہیں اصول کے کاربند ہونیکی وجہ سے دوسرے وقت وہی قوم اس ساری ترقی اور تہذیب اور عظمت اور شرافت کو کھوکر ذلت کے اتھاہ گڑھے میں گرجائے۔ پس اسکا باعث کوئی اور ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف مغربی اقوام کے بہت سے وہ رواج جن کو آج ان کی ترقی کا باعث بتایا جاتا ہے۔ وہی ہیں جو ابتدائے زمانہ عیسویت سے چلے آتے ہیں۔ یا کم از کم ایسے ہیں جنپر عیسائی لوگ ۲/۳ صدیاں بعد قائم ہوگئے تھے مگر انہی اصول پر چلکر مدت تک یورپ پر سخت جہالت کی تاریکی چھائی رہی اور صرف وہی روشنی کی شعاع تھی جو اسلام کے بلند منارہ سے آتی تھی۔ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو اسلام کے اصول اور قوانین میں کوئی ایسا ذاتی نقص ہے جس سے یہ نتیجہ صحیح طور پر نکالا جاسکتا ہو کہ ان اصول اور قوانین کے چھوڑنے پر ہی اسلام کی ترقی منحصر ہے اور نہ ہی عیسائی قوموں کے قوانین اور رواجوں میں واقعی کوئی ایسی خوبی ہے کہ ان پر چلکر مسلمان کسی ترقی کی امید کرسکیں۔ اور نہ ہی کوئی عقلمند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ پہلے زمانہ میں اسلام کے اصول اور قوانین اس کی ترقی کا باعث تھے مگر اب وہی اصول اور قوانین اس کے تنزل کا باعث ہورہے ہیں۔ یا یہ کہ اگرچہ عیسائی قوموں کے رواج اور قوانین پہلے زمانہ میں انکے تنزل اور جہالت کا باعث تھے مگر اب وہی رواج اور قوانین انکی ترقی کا باعث ہوگئے ہیں۔ اور ان میں کوئی نئی طاقت پیدا ہوگئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس عروج پر مذہب اسلام نے اپنے پیروؤں کو پہنچایا۔ دوسرے کسی مذہب کو کبھی اس کامیابی کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دوسری قوموں نے ترقی نہیں کی بلکہ جو کچھ ترقی انہوں نے کی وہ اُن کی اپنی کوششوں کا نتیجہ تھا یا ہے مگر مسلمان محض اپنے مذہب کی وجہ سے دنیا کے رہبر اور ہادی بنے۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کی ترقی ان اصول پر عمل کرنیکی وجہ سے ہوئی جو ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلائے تھے۔ مگر دوسری قوموں کی ترقی میں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ یہ بات اسقدر صاف ہے کہ کسی شہادت کی ضرورت نہیں رکھتی۔ اسلام کی ترقی کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کے ساتھ ہی رکھی گئی۔ اور آپ کے زمانہ سے پچیس ۲۵ سال کے اندر اندر مسلمان نہ صرف دنیا کی اول درجہ کی فاتح قوم ہی بن گئے بلکہ انہوں نے دنیا کے تاریک کونوں میں نور علم کو پھیلایا۔ وہ نیکی اور پرہیزگاری کے نمونے دنیا کے لئے بنے وہ صاحبِ علم وفضل وہنر تھے اور ہر رنگ میں جس سے انسان کو شرف انسانیت حاصل ہے وہ دنیا کی سب قوموں پر فوقیت لے گئے۔ اور دنیوی اور اخلاقی وجاہت انکے ہاتھ میں اسوقت تک رہی جبتک کہ وہ پوری طرح سے ان پاک اصول کے پابند رہے جو ان کے ہادی نے انکو سکھائے تھے۔ لیکن جب مرور زمانہ کے ساتھ وہ خود غافل اور سست ہوتے گئے۔ اور جب انہوں نے ان اصول کو چھوڑ دیا تو اس عزت نے بھی جو محض اسلام کی بدولت انکو نصیب ہوئی تھی انکا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ رنگ دوسرے مذاہب میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔ مثلاً عیسائی مذہب کو ہی

دیکھ لو۔ اسکے پیروؤں نے تین سو سال تک کوئی نمایاں ترقی نہیں دکھائی۔ تین صدیوں کے گذر نیکے بعد دنیوی وجاہت عیسائیت کو حاصل ہونی شروع ہوئی۔ مگر باوجود اس کے کہ اسکے بعد ایک ہزار سال تک عیسائیت کا غلبہ یورپ میں رہا مگر جہالت کی تاریکی تمام براعظم پر چھائی ہوئی تھی اور کوئی خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنیکے قابل ترقی اس قوم کی اس زمانہ میں نہیں پائی جاتی۔ وہ سخت درجہ کی جہالت اور توہم پرستی میں ڈوبے رہے اور عیسائی مذہب کے اصول نے کوئی نئی روح ان میں پھونک کر نہ دکھائی۔ جیسا کہ اسلام میں ہم ایک عظیم الشان نفخ روح دیکھتے ہیں کہ جیسا جیسا قومیں اسلام قبول کرتی گئیں وہ دوسری قوموں سے بیّن طور پر ممتاز ہوتی گئیں۔ عیسائی قوموں نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ بہت قریب کے زمانہ کی ہے۔ اور اسوقت سے شروع ہوتی ہے جب عیسائیت کا اثر لوگوں کے دلوں سے زائل ہونا شروع ہوگیا تھا پس جو کچھ مادّی ترقی عیسائی اقوام نے کی ہے وہ صرف انکے ہمہ تن مردار دنیا پر گر پڑنے اور آخرت سے بالکل غافل ہوجانیکی وجہ سے ہے۔ انہوں نے دولت کے دیوتا کی پرستش شروع کی اور دولت کو حاصل کیا۔ پس انکی ترقی اور مسلمانوں کی ترقی دو الگ الگ ٹریکوں پر چلنے سے ہوئی۔ اور اس امتیاز کو بھول جانیسے مدعیان اصلاح نے ٹھوکر کھائی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دو طرح پر انسان ترقی کرسکتا ہے اور اس کے لیے دو الگ الگ راہیں ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن شریف میں بھی یہ اشارہ پایا جاتا ہے۔ من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم یصلٰھا مذموما مدحورا ۝ ومن اراد الاٰخرۃ وسعٰی لھا سعیھا وھو مؤمن فاولٰئک کان سعیھم مشکورا ۝ کلا نمد ھٰؤلاء وھٰؤلاء من عطاء ربک وما کان عطاء ربک محظورا۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۸۔ ۲۰)۔ جو شخص دنیا کا طالب ہو تو ہم جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں اسی دنیا میں سردست اسکو دیدیتے ہیں مگر پھر آخر کار ہم نے اسکے لیے دوزخ ٹھہرا رکھا ہے جس میں وہ برے حال سے راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو شخص طالب آخرت ہو اور آخرت کے لیے جیسی کوشش کرنی چاہیئے ویسی اس کے لیے کوشش بھی کرے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو یہی وہ لوگ ہیں جن کی محنت مقبول ہوگی۔ انکو اور انکو یعنی کیا دنیا کے طالبوں کو اور کیا آخرت کے طالبوں کو ہم تیرے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں اور تیرے پروردگار کی بخشش عام ہے کسی پر بند نہیں۔ اس آیت شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا فرق ہے جو مسلمانوں کی ابتدائی زمانہ کی تہذیب اور عیسائی اقوام کی اس زمانہ کی تہذیب میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے آخرت کے لیے سعی کی اور دین کو دنیا پر مقدم کیا۔ دنیا طلبی کی بجائے راستبازی کا راہ اختیار کیا اور خدا نے اپنے وعدہ کے مطابق اس دنیا میں بھی انکو عروج اور اقبال بخشا۔ اور ترقی کے اوج اور تہذیب کے بلند مینار پر پہنچایا۔ کیونکہ جو شخص خدا کی راہ میں لگتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس دنیا میں بھی اجر دیتا ہے۔ اور اپنی برکات نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دنیا میں بھی اسپر نازل فرماتا ہے۔ برعکس اسکے عیسائیوں نے صرف دنیا طلبی پر زور دیا اور دنیا پر ہی اپنے قویٰ کو صرف کیا۔ اور اسی دنیا کے عیش اور عشرت کے سامانوں کی تلاش میں لگ گئے سو خدا نے صرف اسی دنیا کی

ان کو حصہ دیا اور وہ آخرت سے محروم رہ گئے۔ یہ بات کہ واقعی مغربی یعنی عیسائی اقوام کی تمام ہمت اس وقت بکلی دنیا پر ہی صرف ہوتی ہے۔ محتاج ثبوت نہیں بلکہ جس شخص نے ان لوگوں کے حالات پر کچھ بھی نظر کی ہے۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے۔ عیسائی صاحبان خود اس کے اقراری ہیں چنانچہ اخبار ہاروسٹ فیلڈ کے ایک تازہ پرچے میں پادری موناہن نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ مغرب میں مذہب کی کیا حالت ہے۔ وہ لکھتا ہے دو قریباً بیس سال سے انگلستان کی مذہبی زندگی میں زوال کے خطرناک آثار پائے جاتے تھے۔ دنیا پرستی اور دنیا طلبی تمام خیالات پر غالب آئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ آسایش کے سامانوں میں حیرت انگیز ترقی۔ یہانتک کہ غرباء کے گھروں میں بھی آسایش کے لیے سامانوں کا مہیا ہونا۔ کھیل کود کے پیچھے دیوانوں کی طرح لگے رہنا۔ ہر وقت طلب عیش میں لگے رہنا۔ یہ تمام نشان تھے کہ انگریز حد سے بڑھکر دنیا پر گر گئے تھے۔ ان سب سے بڑھکر صاحب دولت بننے کی دیوانہ وار تڑپ ہے جس کی غرض صرف یہ ہے کہ زیادہ روپیہ حاصل کر کے عیش وعشرت کے سامان زیادہ مہیا کیے جاویں۔ اسپر تجارت کے مقابلہ اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں دوڑ دھوپ کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسطرح پر تمام واقعات کی رو مذہبی زندگی کی بیخ اکھاڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے پاس پاکیزگی حاصل کرنیکے لیے کوئی وقت ہی نہیں تھا۔ اور نہ دعا کرنیکے لیے کوئی وقت تھا۔ خود کلیسیا کی زندگی شہادت دے رہی تھی کہ زمانہ کسقدر فسق وفجور میں مبتلا ہو گیا ہے۔ آخرت کا خیال قطعاً دلوں سے اُٹھ گیا۔ کلیسیا میں دنیاداری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور اب تک ہے۔ اور مذہب کو دنیا طلبی کے ساتھ خطرناک طور پر ملایا گیا ہے"

اس مضمون کا لکھنے والا خیال کرتا ہے کہ اب پانچ چھ سال سے انگلستان کی حالت بدل گئی ہے مگر یہ محض خوش اعتقادی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ دنیا کی محبت کی آگ روز بروز تیز ہو رہی ہے اور کل قوائے انسانی اور ہمت کو صرف دنیا طلبی پر ہی صرف کیا جا رہا ہے۔ بلکہ جہاں مذہب کا ذکر بھی ہے وہ بھی صرف زبان سے ہے اور دل میں کچھ بھی نہیں۔ حضرت مسیح کے پہاڑی وعظ کے بعض فقرات اسی بات کے مؤید ہیں جسکا ذکر میں نے اوپر کیا اور انسے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی دنیا کی موجودہ مادی ترقی خالص دنیا طلبی کا نتیجہ ہے اور یہ عیسائی ہونیکی وجہ سے نہیں بلکہ دہریہ ہونیکی وجہ سے ہے۔ مثلاً حضرت مسیح فرماتے ہیں "مال اپنے واسطے زمین پر جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور مورچہ خراب کرتے ہیں اور جہاں چور سیندھ دیتے اور چراتے ہیں بلکہ مال اپنے لیے آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا نہ مورچہ خراب کرتے اور نہ وہاں چور سیندھ دیتے اور چُراتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تمہارا خزانہ ہے وہیں تمہارا دل بھی لگا رہیگا۔ .... کوئی آدمی دو خاوندوں کی خدمت نہیں کرسکتا اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھیگا اور دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانیگا اور دوسرے کو ناچیز جانیگا۔ تم خدا اور دولت کے دیوتا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے لیے فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پیئیں گے نہ اپنے بدن کے لیئے کیا پہنیں گے ..... پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جاتی ہے

یوں پہناتا ہے، تو کیا تم کو اے کم اعتقادو زیادہ نہ پہنائیگا۔ اس لیے یہ کہکے فکر مت کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پیئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں اور تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو پر تم پہلے خدا کی بادشاہت اور اسکی راستبازی کو ڈھونڈو۔ اور یہ سب چیزیں بھی تمہیں ملیں گی۔"

اب کوئی پادری صاحب غور کر کے بتاویں کہ کیا مغربی یعنی عیسائی اقوام اس زمانہ میں خدا کی بادشاہت اور اسکی راستبازی کو ڈھونڈ رہی ہیں اور دنیا کی چیزیں انکو یونہی ملتی ہیں یا کہ وہ دنیا کی چیزوں کی طلب میں دیوانوں کی طرح لگی ہوئی ہیں اور خدا کی بادشاہت اور راستبازی کا خیال انکے پاس پھٹک بھی نہیں گیا۔ اور یوں حضرت مسیح کے زمانے کی غیر قوموں کا تتبع کر رہی ہیں۔ پس عیسائیوں کے لیے موجودہ مادّی ترقی باعث فخر نہیں اور نہ خوشی کرنیکی جگہ ہے بلکہ رونے کی جگہ ہے کہ وہ اس حقیقت سے دور جا پڑے ہیں کہ انسان کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے۔ جو کچھ وہ حاصل کر رہے ہیں وہ دولت کے دیوتا کی پرستش سے حاصل کر رہے ہیں اور اس لیے خدا کے ساتھ ان کی محبت نہیں رہ سکتی یہ تو ان قوموں کا حال تھا مگر اب اور بھی زیادہ افسوس ہے کہ بعض مسلمان بھی عیسائی لوگوں کے نقش قدم پر چلکر ہمہ تن دنیا میں ہی مصروف ہونا چاہتے ہیں۔ انکو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس طرح سے وہ مسلمانوں کو ترقی نہیں بلکہ تنزل کی راہ پر چلائیں گے مسلمانوں کے لیے ان کی ہمتوں کا مرجع یہ ذلیل مقصد کبھی نہیں ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ مردار دنیا پر گر پڑیں بلکہ انکو یہی تعلیم دیگئی تھی کہ وہ راستبازی کو مقدم رکھیں۔ اور دنیا کی ضروری چیزیں خود انکے پاس آئیں گی۔ پس تقویٰ اور راستبازی ہی ان کا مقصد اعلیٰ تھا اور ہے۔ اور ان لوگوں کو جو بلا سوچے سمجھے اصلاح کے مدعی بن بیٹھے ہیں اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ مسلمانوں کا قدم ہمت محض دنیا طلبی نہ تھا اور نہ اب ہونا چاہیئے۔ ورنہ وہ بھی دوسری قوموں کی طرح محض ایک دنیا پرست اور آخرت سے بے بہرہ قوم ہو جائیگی۔ راستبازی اور تقوے کی راہوں سے ہی وہ پہلے بڑے بنے اور انہی راہوں پر چلکر وہ اپنی گم گشتہ بڑائی کو پھر پا سکتے ہیں۔ دوسری قوموں کی ترقی ان کے لیے نظیر نہیں کیونکہ جس طرح قرون اولے کے مسلمانوں نے معمولی دنیوی راہوں پر چلکر ترقی اور عزت کو نہیں پایا بلکہ تقویٰ اور راستبازی ہی انکی تمام ترقیوں کا سرچشمہ تھا۔ ایسا ہی اب بھی انکی ترقی کے لیے یہی راہ ہے۔ اور دنیا پر گری ہوئی قوموں کے نقش قدم پر چلانے سے وہ کبھی اُٹھ نہیں سکتے۔ جیسا خدا نے خارق عادت طور پر پہلے انکو ترقی دی کیونکہ انہوں نے راستبازی سے پیار کیا اور دین کو دنیا پر مقدم کیا ایسا ہی وہ پاک ذات اب بھی کریگا۔ لیکن اسکے لیے ضروری ہے کہ وہ انہیں تقوے کی راہوں پر پھر قدم ماریں اور راستبازی سے پیار کریں اور آخرت کو دنیا پر مقدم کریں۔

اگر مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھا جاوے جب انکے اقبال کا ستارہ عروج پر تھا تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی معمولی دنیوی رنگ کی ترقی نہ تھی۔ اگر مجموعی نظر سے دیکھا جاوے تو اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کے وقت مسلمانوں میں بیدینی اور لامذہبی کی کبھی وہ حالت نہیں ہوئی جو آجکل کی مہذب قوموں کی حالت ہے۔ بلکہ ایک عرصہ

درازتک جیسے وہ اپنی دنیوی ترقی اور تہذیب کے لیے مشہور تھے ویسا ہی اپنی راستبازی اور نیکی کی وجہ سے بھی شہرت رکھتے تھے۔ بلکہ جب وہ راستبازی کے اعلیٰ مقام سے گرے تو اس وقت بھی انکی حالت ایسی ذلیل کبھی نہیں ہوئی جیسے کہ عیسائی اقوام کی ہو رہی ہے۔ چنانچہ نہ ہی اپنی اعلیٰ درجہ کی ترقی کے وقت اور نہ ہی اس تنزل کی حالت میں عیسائی اقوام کی مخصوص بدیاں جو تمام بدکاریوں کی جڑھ اور تمام بداخلاقیوں کی ماں ہیں یعنی شراب خوری زناکاری اور قماربازی جو یورپ کے ماتھے پر سیاہ دھبہ ہیں ان میں کبھی اس طرح پر نہیں پھیلیں۔ اُسوقت جب وہ دنیوی ترقی کے معراج پر پہنچے ہوئے تھے اسوقت بھی انکی زندگیوں کے اندر مذہبی روح موجود تھی اور ہر طرح کی شان وشوکت اور آسایش کے سامانوں کے باوجود وہ پانچ وقت اپنے مولیٰ کے حضور جھکتے اور گڑگڑاتے تھے اور بادشاہ سے لیکر فقیر تک ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے تھے۔ غرضکہ جو لامذہبی اور بیدینی اِس تہذیب کے زمانے میں یورپ اور امریکہ میں پھیلی ہوئی ہے وہ مسلمانوں کے اندر کبھی نہیں پھیلی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا مسلمان بھی نیکی اور پرہیزگاری کے بہت سے اعلیٰ اصول سے گرتے گئے۔ اور تعلیم اسلام کے اصل مغز کو بھول گئے اور اس کے ساتھ ہی ان کے دنیوی اقبال میں بھی زوال شروع ہو گیا۔ مگر وہ گرے بھی تو ایسے نہیں گرے کہ پھر اُٹھ نہ سکیں۔ جیسا کہ بہت سی دوسری اقوام کا انجام ہوا جن کی غرض صرف دنیا طلبی ہی تھی۔ اسلام کے لیے یہ خوشخبری موجود ہے کہ وہ ابھی پھر ایک دفعہ اُٹھیگا اور دنیا کے تمام مذاہب پر غالب آئیگا اور یہ خوشخبری اُسی مخبر صادق نے دی ہے جس نے مسلمانوں کی اول حالت عروج اور اس کے بعد زوال کی اطلاع دی تھی جو پوری ہو چکی۔ پس یہ وقت اب پھر اسلام پر آنیوالا ہے کہ لیظھرہ علی الدین کلہ کا وعدہ پورا ہو۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ جس راہ پر چلکر مسلمان پہلے کامیاب ہوئے تھے اُسی راہ پر چلکر وہ پھر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یعنی تقوےٰ طہارت اور راستبازی کے ذریعہ۔ جس کے لیے یہ بشارت ہے کہ آخری زمانہ میں راستبازی اور ایمان مسیح موعود اور مہدی کے ذریعہ دنیا میں قایم ہونگے۔ سو وہ وقت آچکا ہے اور وہ مقدس امام ظاہر ہو چکا ہے جس نے دیکھنا ہو دیکھے۔

اصل کلام کی طرف رجوع کر کے مَیں پھر یہ کہتا ہوں کہ مسلمان اگر ترقی کے خواہاں ہیں تو اُسی راہ سے پھر اسے تلاش کریں جس راہ پر چلکر انکے بزرگوں کو پہلے ترقی ملی تھی۔ اور وہ مغربی اقوام کے خالص دنیوی طریقوں سے پرہیز کریں۔ کیونکہ انکی دنیا طلبی جو حد سے گذری ہوئی ہے مذہبی روح کے لیے سمِ قاتل ہے۔ قرآن کریم تو یہ تعلیم دیتا ہے مگر عیسائی صاحبان اگر حضرت مسیح کے اقوال پر ہی غور کریں تو انسے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ دنیا بیشک اس بات کو عجیب اور ناممکن سمجھتی ہے کہ راستبازی کے اختیار کرنیسے دنیوی برکات بھی انسان کو حاصل ہوتی ہیں مگر یہی تمام راستبازوں کا تجربہ ہے اور اسلام کی تاریخ اسپر کھلا کھلا گواہ ہے۔ خود مسیح نے بھی یہی تعلیم دی اگرچہ اس کے پیرووں نے اسکی تعلیم کی پیروی نہیں کی۔ جو شخص کچھ بھی نظر غور سے قرآن شریف کو پڑھیگا وہ دیکھ لیگا کہ اسلام نے تزکیہ نفس اور راستبازی پر کسقدر زور

دیا ہے۔ نہ صرف مذہبی عبادات کے احکام میں ہی یہ بات پائی جاتی ہے بلکہ ہر ایک قسم کے قوانین خواہ وہ تمدن کے متعلق ہوں یا معاشرت کے یا ملکی قوانین ہوں یا سزاؤں کے متعلق ہوں یا کسی قسم کی نہی ہو۔ ہر جگہ راستبازی کو ایک سچے مسلمان کے لیے اصل ٹھہرایا ہے۔ اور ہر قسم کے احکام کے ساتھ ساتھ تقوے کے لیے اسقدر تاکید فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ہر حکم اور نہی کی بنیاد تقوے پر ہی رکھی گئی ہے۔ اس کی میں ایک موٹی مثال سورۂ طلاق سے پیش کرتا ہوں جہاں طلاق کے دینے میں چند امور کا ملحوظ رکھنا بیان کیا گیا ہے مگر عجیب رنگ میں ایک ایک فقرہ کے ساتھ تقوے کی ہدایت اور تاکید کو دوہرایا گیا ہے۔ یٰایّھا النّبیّ اذا طلّقتم النّسآء فطلّقوھنّ لعدّتھنّ واحصوا العدّۃ ج واتّقوا اللہ ربّکم ج لا تخرجوھنّ من بیوتھنّ ولا یخرجن الّآ ان یّاتین بفاحشۃٍ مّبیّنۃٍ ط وتلک حدود اللہ ط ومن یّتعدّ حدود اللہ فقد ظلم نفسہٗ ط لا تدری لعلّ اللہ یحدث بعد ذلک امرًا ۝ فاذا بلغن اجلھنّ فامسکوھنّ بمعروفٍ او فارقوھنّ بمعروفٍ وّاشھدوا ذوی عدلٍ مّنکم واقیموا الشّھادۃ للہ ط ذٰلکم یوعظ بہٖ من کان یؤمن باللہ والیوم الاٰخر ۝ ومن یّتّق اللہ یجعل لّہٗ مخرجًا ۝ ویرزقہ من حیث لا یحتسب ط ومن یّتوکّل علی اللہ فھو حسبہٗ ط انّ اللہ بالغ امرہٖ ط قد جعل اللہ لکلّ شیءٍ قدرًا ۝ والّٰئی یئسن من المحیض من نّسآئکم ان ارتبتم فعدّتھنّ ثلٰثۃ اشھرٍ وّالّٰئی لم یحضن ط واولات الاحمال اجلھنّ ان یّضعن حملھنّ ط ومن یّتّق اللہ یجعل لّہٗ من امرہٖ یسرًا ۝ ذٰلک امر اللہ انزلہٗ الیکم ط ومن یّتّق اللہ یکفّر عنہ سیّاٰتہٖ ویعظم لہٗ اجرًا + ان آیات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے حکم کے ساتھ قرآن شریف نے تقوے کی شرط ضروری لگادی ہے۔ پس تمام کے تمام اسلامی قوانین اور سنن کی بنیاد تقوے پر ہے۔ اور بدون تقوی وہ قوانین اپنی اصل حالت پر نہیں رہ سکتے۔ صحابہؓ اور ابتدائی زمانہ کی مسلمانوں کی ترقی کا یہی راز تھا کہ انہوں نے اسلامی قوانین کی اصل حقیقت کو سمجھ لیا تھا اور یہ جان لیا تھا کہ ان سب قوانین کی جان تقویٰ ہے۔ اور تقوے کے بغیر وہ ایسے ہیں جیسے جسم بلا روح۔ اس گُر کو سمجھ لینے سے مسلمانوں کی کامیابی اور ترقی گذشتہ زمانہ میں اور مسلمانوں کا تنزل اس زمانے میں بخوبی سمجھ آسکتا ہے۔ اسکو دوسری قوموں پر قیاس مت کرو بلکہ اسلام کی اپنی تاریخ میں اسکے صحیح اسباب ملتے ہیں۔ جب تک مسلمان قرآن کریم کے احکام کی اصل حقیقت پر قایم رہے اور اس بنیاد کو جس پر یہ احکام مبنی تھے قایم رکھا اُسوقت تک اقبال نے بھی انکا ساتھ نہیں چھوڑا۔ لیکن جب اصل بنیاد ان احکام کی جو تقویٰ تھی قایم نہ رہی تو وہ عمارت بھی قایم نہ رہی جو اس بنیاد پر کھڑی تھی اور مسلمانوں نے تنزل کے دنوں کو دیکھا جو شخص واقعی اس تلاش میں ہیں کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی حالت کے تنزل کے اسباب کو

دریافت کریں انہیں ان امور پر خوب غور کرنا چاہیئے۔ اسلام کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عظیم الشان ترقیوں کا زمانہ اسلام کی پہلی تین صدیاں تھیں۔ اور بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ اسلام میں بڑی نیکی اور راستبازی کا زمانہ پہلی تین صدیاں ہی ہیں اور کہ اس کے بعد لوگ تقوے کی راہوں پر قایم نہ رہیں گے۔ پس جیسا اِدھر مسلمان فیج اعوج کے زمانہ میں (جو تین صدیوں کے بعد شروع ہوتا ہے) اصل راہ سے منحرف ہوتے گئے اُدھر انکے تنزل کا زمانہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ انکی ترقی اور تنزل کے زمانہ میں معمولی قوانین یکساں ہی ہیں اور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے کوئی اور قوانین ہوں جن پر وہ عمل کرتے ہوں اور پھر ان قوانین کو بدل دینے سے تنزل کی حالت پیدا ہوئی ہو بلکہ اگر کوئی فرق آیا ہے تو وہ صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہوں کا گم ہوجانا ہے۔ تقوی ان احکام کی جان تھی سو جب جان جسم سے نکل گئی تو جسم بھی بیکار رہ گیا۔ یہی ایک وجہ ہے کہ جو قوانین ایک زمانہ میں مسلمانوں کی عظیم الشان ترقیوں اور کامیابیوں کا موجب تھے بعد میں ان سے یہ روح اور قوت جاتی رہی۔ پس اب اصلاح کی تجویز یہ نہیں کہ اس بیجان جسم کو بھی خاک میں ملا دیا جاوے بلکہ اصلاح صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ پھر ان تجاویز پر عمل کیا جاوے جن سے از سرِ نو اس مردہ جسم میں جان داخل ہوجاوے ہاں یہ انسانوں کی کوشش سے نہیں ہو سکتا اور نہ ہی پہلے انسانوں کی کوشش سے ایسا ہوا تھا۔ بلکہ جس طرح پہلے اس ایمان اور راستبازی کو جو کل احکام کی روح ہے پیدا کرنیوالا کلام الٰہی تھا اسی طرح اب بھی کلام الٰہی کے سرچشمہ سے ہی وہ تازگی اور روح پیدا ہو سکتی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اول مَیں اسلامی قانون وراثت کو قرآن شریف سے پیش کرتا ہوں اور بعد میں اسکا مقابلہ دوسرے مروجہ قوانین وراثت سے کرکے یہ دکھاؤنگا کہ صحیح اور سچا قانون صرف وہی ہے جو تیرہ سو سال ہوئے اسلام نے پیش کیا تھا۔ اور دنیاداروں کے تجویز کیے ہوئے قوانین سراسر خلاف انصاف ہیں۔ اور اسی ضمن میں یہ بھی ذکر کیا جاویگا کہ نئے مدعیان اصلاح جو لامذہبی کو اسلام کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کونسی اصلاحیں اسلامی قانون وراثت میں کرنی چاہتے ہیں اور انکی حقیقت کیا ہے۔ سب سے اول مَیں وہ آیت پیش کرتا ہوں جو قانون وراثت کے لئے بطور اصل کے ہے۔ یہ آیت سورہ نساء میں ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقربون ۪ وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او كثر ۭ نصيبا مفروضا۔ یعنی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں مردوں کا حصہ ہے اور ایسا ہی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ خواہ وہ ترکہ تھوڑا ہو یا بہت۔ اور یہ حصہ مقرر کردہ اور ٹھہرایا ہوا حصہ ہے۔ اس حصہ کا ذکر جسکا اشارہ یہاں پایا جاتا ہے اس سے اگلے رکوع میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن اسجگہ اللہ تعالیٰ صرف یہ فرماتا ہے کہ ترکے میں سے مردوں کو اور عورتوں کو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملنا چاہیئے خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ اس سے ان تمام قوانین وراثت کی اصلاح کی گئی ہے جنہوں نے عورتوں کو ہمیشہ کے لئے محروم الارث قرار دے

رکھا تھا۔ خود عرب کی حالت تو یہ تھی کہ عورتوں کو بجائے ورثہ میں سے حصہ دینے کے خود ورثہ کا حصہ سمجھا جاتا تھا اور وہ وارثوں کا مال ہوتی تھیں جس سے وہ بدرسم بھی پیدا ہو گئی تھی جسے قرآن شریف نے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ کہکر حرام کیا۔ یعنی بیٹے باپ کی عورتوں کو بھی جائداد کا حصہ سمجھکر تصرف میں لاتے تھے۔ یہ تو عرب کی حالت تھی جو بسبب ایک وحشیانہ حالت میں ہونیکے کہا جا سکتا ہے کہ عورت کو ذلیل سمجھتے تھے مگر مہذب سے مہذب اقوام نے بھی ابھی تک اسقدر ترقی نہ کی تھی کہ وہ عورت کو حصول جائداد میں ہر طرح مرد کے مساوی حقوق دیں۔ اور نہ ہی اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ بات حاصل ہوئی تھی کہ وہ عورت کو ایسے حقوق دیں۔ جیسا کہ آگے چلکر دکھایا جاویگا۔ ان مخالفین یا برائے نام موافقین اسلام کو جو اسلام پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس نے عورت کی قدر کو نہیں پہچانا اور اسے ذلیل حالت میں رکھا ہے اس موقع پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ عورت کو اس سے بڑھکر فائدہ کسی طرح سے نہ پہنچایا جا سکتا تھا۔ کہ اسے مرد کے ساتھ ترکہ میں وارث قرار دیا جاوے اور اس طرح پر حصول جائداد میں اسکو مرد کے سے حقوق دیئے جاویں۔ یہ دنیا کے موجودہ قوانین میں ایک عظیم الشان اصلاح تھی۔ جسکو ایک عرب کے اُمّی نے (فداہ امی و ابی) پہلے دنیا میں رائج کیا سبحان اللہ کیسی قوت قدسی اس وجود پاک کی تھی کہ ایک دم میں وہ کام کر دکھایا جو ہزاروں سالوں کی تدریجی مادی ترقی دنیا میں نہیں کر سکی۔ اس آیت سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وصیّت کا حکم جو اس سے بعد کی آیتوں میں ہے وہ ایک خاص حصہ جائداد کے لیے ہے کیونکہ اس آیت میں یہ ضروری ٹھہرایا گیا ہے کہ کچھ نہ کچھ حصہ جائداد کا ورثا کے لیے چھوڑا جاوے اور احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ وصیّت نہ کی جاوے تاکہ ورثا بالکل محروم نہ ہو جاویں۔ اسکے بعد قرآن شریف میں ورثا کے حصص بیان کیے گئے ہیں۔ اسبارے میں ذیل کی آیات سورہ نساء کی ہیں جنکو میں بلا ترجمہ دیتا ہوں يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ

من ذٰلک فھم شرکآء فی الثلث من بعد وصیۃ یوصٰی بھا اودین غیر مضآرٍّ وصیۃ من اللہ ط واللہ علیم حلیم ۔ تلک حدود اللہ ط ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنّٰت تجری من تحتھا الانھر خٰلدین فیھا ط وذٰلک الفوز العظیم ۔ ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعدّ حدودہ یدخلہ نارًا خالدًا فیھا ولہ عذاب مّھین ۔ ..... یستفتونک ط قل اللہ یفتیکم فی الکلٰلۃ ط ان امرؤا ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلھا نصف ما ترک ج وھو یرثھا ان لم یکن لھا ولد ط فان کانتا اثنتین فلھما الثلثٰن مما ترک ط وان کانوا اخوۃ رجالا ونساء فللذکر مثل حظ الانثیین ط یبین اللہ لکم ان تضلوا ط واللہ بکل شیء علیم ۔

ان آیات سے بہت سے نئے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً عورت کو نہ صرف ترکہ میں مرد کے ساتھ حقدار قرار دیا ہے بلکہ اسے وصیت کرنے اور قرضہ لینے کے بھی وہی حقوق دیے گئے ہیں جو مردوں کو دیے گئے ہیں اس طرح پر گویا کل حقوق حصول جائداد میں عورت کو مرد کے برابر رکھا ہے۔ اور کسی قسم کی روک اسپر نہیں ڈالی نیز اس قانون وراثت کے رو سے جائداد منقولہ غیر منقولہ میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ دونوں کے لیے ایک ہی حکم ہے۔ تیسرا صاحب جائداد کو وصیت کا حق دیا گیا ہے جسکی حد بندی پہلی آیت سے اور بعض حدیثوں سے ایک ثلث جائداد تک ہے جیساکہ اوپر ذکر ہوا۔ چوتھا ایک ہی درجہ کے قریبیوں میں ایسا نہیں کیا کہ بعض کو زیادہ حصہ دیدیا ہو اور بعض کو محروم کر دیا ہو۔ بلکہ برابر حقوق رکھے ہیں۔ لیکن جہاں مرد اور عورتیں ایک ہی درجہ کی قریبی ہوں وہاں مرد کا حصہ عورت سے دوگنا رکھا ہے۔ سب قریبیوں کو حقوق دینے میں اسلام نے اس غرض کو مدنظر رکھا ہے کہ سب برابر فائدہ اٹھائیں اور ایسا نہ ہو کہ بعض لوگوں کے پاس روپیہ جمع ہوتا چلا جائے اور بعض بکلی محروم رہ جائیں اور انکی نوبت مفلسی تک پہونچے جیساکہ انگریزی قانون وراثت کے رو سے ہوتا ہے۔

یہ قانون آج سے تیرہ سو سال پہلے ایک ایسے ملک میں دیا گیا جہاں تہذیب کی روشنی نے اس سے پہلے کبھی طلوع نہ کیا تھا۔ عرب کی حالت جو زمانہ جاہلیت میں تھی اسپر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس گڑھے سے نکالکر اسلام نے عربوں کو کس بلندی پر پہنچایا اور خصوصاً عورت کی حالت میں کیسی حیرت انگیز اصلاح کر دکھائی۔ وہ اصلاح جو آجتک یورپ کو باوجود تہذیب کے بڑے دعوے کے نصیب نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن امور سے عورت ذات کی حالت میں ترقی ہو سکتی تھی انہیں امور کو اسلام نے لیا۔ اور عملی طور پر جو فائدہ عورت کو پہنچایا جاسکتا تھا وہ پہنچایا۔ بعض لوگ خواہ نخواہ بھی اسلام پر اعتراض کر دیتے ہیں جیساکہ مثلاً پردہ کا اعتراض۔ حالانکہ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ پردہ کا حکم بھی اسلام نے عورت کی بلکہ سوسائٹی کی بہتری کے لیے ہی دیا ہے کیونکہ مردوں اور عورتوں کے کھلے میل جول سے

جو نقصان پیدا ہوتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ پس جہاں عورت کی بہتری کے لیے اور تجاویز جیسے مثلاً قانون وراثت وغیرہ اسلام نے پیش کیں وہاں پردہ بھی ایک تجویز اسی غرض کو حاصل کرنے کے لیے تھی۔

اسلامی قانون وراثت پر ان دنوں میں بڑی بحثیں ہوئی ہیں مگر تمام اعتراضات کا ماحصل صرف یہ ہے کہ اس طرح سے جائداد کے چھوٹے چھوٹے حصے ہو جاتے ہیں۔ اور اس لئے اسلامی ممالک میں بڑی بڑی جائدادوں والے امرا کی کوئی طاقتور جماعت قائم نہیں رہ سکتی۔ ایسی جماعت کی ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ تا یہ لوگ بادشاہ اور رعایا کے درمیان واسطہ ہو کر بادشاہ کو مطلق العنانی اور ظلم سے روک سکیں۔ اور یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسلامی سلطنتوں کے زوال کا باعث یہی امر ہے کہ ان میں اس قسم کے امرا نہ تھے۔ یہ اعتراض کئی وجہ سے لغو ٹھہرتا ہے۔ اسلام اس امر کا مانع نہیں ہے کہ اس میں ایسے لوگ نہ ہوں جو عمائد سلطنت کے طور پر ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ اسلام کے نزدیک صرف روپیہ یا جاگیر کا ہونا کسی شخص کے مکرم اور معزز ہونے کی علامت نہیں۔ بلکہ قرآن شریف فرماتا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم یعنی بڑا آدمی خدا کے نزدیک وہی ہے جو بڑا متقی ہے۔ پس خالی امرا کی بجائے اسلام ایسے آدمیوں کو چاہتا ہے جو بڑے راستباز اور علم اور معرفت میں کامل ہوں۔ اب معترضین غور کریں کہ آیا اس قسم کے لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اور جن کی عزت اور اکرام کے لیے وہ تاکید فرماتا ہے یا وہ لوگ جو روپیہ اور جاگیریں رکھتے ہوں خواہ علم سے بالکل بے بہرہ ہوں اور نہ خدا کا خوف رکھتے ہوں نہ مخلوق سے ہمدردی۔ محض روپیہ اور جاگیروں سے وہ سچی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی جو ایک راستباز اپنے دل میں مخلوق خدا کے لیے رکھتا ہے پس ایسے راستباز کا وجود رعایا اور بادشاہ دونوں کے لیے ایک بیش بہا گوہر ہے اور یہی لوگ ہیں جو وقت پر مخلوق کے کام آتے ہیں۔ اور روپیہ اور جاگیروں والے لوگ اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہی نفسانی اغراض میں مبتلا ہوتے ہیں اور مخلوق کی سچی ہمدردی انکے دل میں کوئی نہیں ہوتی وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جس سے انہیں اپنی جاگیر کے کھوئے جانیکا خطرہ ہو۔ مگر ایک راستباز آدمی کسی سے نہیں ڈر سکتا چنانچہ ان واقعات کی شہادت بھی تاریخ سے ملتی ہے۔ ایک طرف اسلام کے بادشاہوں کی تاریخ پر نظر ڈالو تو صاف معلوم ہوگا کہ علماء اور راستبازوں کی بہت قدر کرنیوالے تھے۔ اور انسے ڈرتے تھے۔ اور انسے مشورے لیتے تھے۔ ابتدائے زمانہ میں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اسلامی بادشاہوں کے نزدیک اور نیز عام رعایا کے نزدیک ایسی عزت تھی کہ بڑے بڑے امرا کی کسی سلطنت کے ماتحت نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد بھی جو لوگ راستبازی اور تقویٰ اور علم کے لحاظ سے شہرت رکھتے تھے وہ بادشاہی درباروں میں بڑی عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور انکی رائے کا بادشاہ پر بہت اثر ہوتا تھا۔ بلکہ جسوقت تک یہ عزت علماء کو دیجاتی رہی اسوقت تک اسلامی سلطنت بھی اپنے عروج پر رہی مگر جب بجائے علم کے روپیہ معیار عزت و شرافت ہو گیا۔ تو پھر اسلامی سلطنتوں کو بھی زوال آنا شروع ہوا۔

برعکس اس کے ایک عیسائی ملک مثلاً انگلستان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ تو اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کے نیچے بڑے بڑے جاگیردار ہوتے تھے جو امرا کہلاتے تھے اور ان امرا کے نیچے رعایا تھی۔ ان امرا کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کی مطلق العنانی پر بڑی روک تھے مگر اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ خودغرض تھے جب انہیں بادشاہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں اپنا فائدہ نظر آتا تھا اور کافی طاقت مقابلہ کے لیے ان کے پاس موجود ہوتی تھی تو وہ رعایا کے ساتھ ملکر بادشاہ کے مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر جب انکی غرض اسکے خلاف ہوتی تو وہ بادشاہ کے ظلم اور مطلق العنانی میں اس کے معاون ہوتے تھے۔ اور علاوہ ازیں جو ظلم کوئی بادشاہ اپنی رعایا پر کرسکتا تھا وہی ظلم یہ لوگ اپنی رعایا پر کرتے تھے۔ اور ملک میں بدانتظامی کی ایک بڑی بُری حالت تھی پس جو شخص آج یہ کہتا ہے کہ ہمیں وہ طریق اختیار کرنا چاہیئے جو وسطی زمانوں میں یورپ میں طرز حکومت کا تھا وہ بالکل جہالت کی بات کرتا ہے اور ایک ترقی کی حالت سے مسلمانوں کو تنزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

اب میں اسی اعتراض پر ایک دوسرے پہلو سے نظر کرتا ہوں۔ یہ اعتراض کہ جائداد ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہے صحیح نہیں کیونکہ تقسیم جائداد میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک چیز کے یا مکان یا زمین کے واقعی چھوٹے چھوٹے حصے ضروری طور پر کئے جاویں بلکہ اصل تقسیم بلحاظ قیمت کے ہوتی ہے۔ پس ایسا ہوسکتا ہے کہ مثلاً ایک شخص متوفی کے مکان لے لیوے ایک زمین اور ایک جائداد منقولہ یا کمی بیشی کو روپے کے ذریعہ پورا کردیا جاوے۔ علاوہ ازیں جیسی جائدادیں ٹکڑے ٹکڑے ہوتی جاویں گی خود اسی قانون کے رو سے وہ ساتھ ساتھ اکٹھی بھی ہوتی جاوینگی۔ کیونکہ اگر ایک ہی وارث متوفّی کی کل جائداد کا مالک نہیں ہوتا تو اسکی کمی اسطرح پوری ہوجاتی ہے کہ وہ بہت سے اشخاص کی جائداد کے تھوڑے تھوڑے حصوں کا وارث ہوجائیگا۔ ہاں یہ طریق بہ نسبت اس دوسرے طریق کے کہ ایک ہی وارث کو سب کچھ ملجائے زیادہ مامون ہے اس لئے کہ اس کے رو سے ہر شخص کچھ نہ کچھ فائدہ اُٹھاسکتا ہے مگر اُس دوسرے قانون کے رو سے بعض بہت جائدادوں کے مالک ہوجائیں گے اور بعض بالکل خالی ہاتھ رہ جائینگے۔ علاوہ ازیں جو بڑی بڑی جاگیریں ریاستوں کے طور پر ہوں انکے لیے تقسیم کا وہ حکم نہیں ہے بلکہ ایسی جاگیریں اسی قانون کی پابند ہونگی جو قانون سلطنت اور حکومت پر حاوی ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی شریعت کے رو سے کل کی کل جائداد وقف بھی ہوسکتی ہے اور اسطرح پر ورثا کو کچھ حصہ آمدنی کا دیا جاکر جائداد ہمیشہ کے لیے اکٹھی رہیگی نہ تقسیم ہوگی اور نہ فروخت۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بھی اسی طرح پر اپنی جائداد کو وقف کردیا تھا پس جس جگہ کوئی صاحب جائداد اس جائداد کے یکجا رکھنے میں کوئی خاص مصلحت دیکھتا ہے۔ وہ اس طریق سے اسکو یکجا رکھ سکتا ہے۔ ہاں اس بارہ میں اس ملک ہندوستان میں جس قانون کو اسلامی قانون سمجھا جاتا ہے وہ بیشک اصلاح طلب ہے نہ اصلی اور حقیقی اسلامی قانون۔

وہ قانون جس کے رو سے کل کی کل غیر منقولہ جائداد خصوصاً زمین کسی متوفی کی بجائے ورثا میں تقسیم ہونے کے بڑے بیٹے کو مل جاتی ہے۔ اسکا نقصان نہ صرف ملکی طور پر ہی ثابت ہوا ہے جیساکہ انگلستان کی تاریخ شہادت دیتی ہے۔ بلکہ جہاں ملکی تعلقات خدمتگذاری کو الگ چھوڑ کر اس قانون کو دیوانی قانون بنا لیا گیا ہے وہاں بھی اسکا نقصان ہی ثابت ہوا ہے۔ انگلستان اور سکاٹلینڈ ہی دو ایسے ممالک ہیں جہاں یہ قانون زمین کے متعلق ابتک رائج ہے کہ زمین ورثا میں تقسیم نہیں ہوتی اور اسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان ممالک کی زمین روز بروز تھوڑے ہاتھوں میں آتی جاتی ہے۔ اور بجائے اس کے کہ بہت سے لوگ تھوڑی تھوڑی زمین رکھیں تھوڑے لوگ بہت زمین رکھنے والے ہوگئے ہیں جس کا اثر کاشتکاری پر بھی برا ہوا ہے۔ مثلاً یہ حساب کیا گیا ہے کہ ان ممالک کی کل زمین میں سے جو سات کروڑ ستر لاکھ ایکڑ ہے۔ نصف سے زیادہ یعنی چار کروڑ ایکڑ سے زیادہ صرف پچیس سو اشخاص کے ہاتھ میں ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انگلستان کی آبادی کا ایک نہایت کثیر حصہ ایسا ہوگیا ہے جن کے پاس نہ اپنی زمین ہے اور نہ ہی اپنا مکان ہے۔ اور ان پر یہ فقرہ خوب صادق آتا ہے کہ ابن آدم کے پاس سر رکھنے کے لیے بھی جگہ نہیں۔ اور دوسرا بد نتیجہ اسکا یہ ہوا ہے کہ کاشتکاری کی محنت دن بدن کم ہوتی جاتی ہے۔ اور گذشتہ نصف صدی میں کاشتکار مزدوروں کی تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی ہے۔ یعنی انگلستان میں ۱۸۵۱ء میں بیس لاکھ کے قریب ایسے مزدوروں کی تعداد تھی مگر ۱۹۰۱ء میں نوّے ہزار سے بھی کم رہ گئی۔ یہ واقعات ایک انگریزی کتاب سے لیے گئے ہیں جس کا نام ہے "رچز اینڈ پاورٹی" یعنی دولت اور مفلسی۔ ان واقعات کو بیان کرنیکے بعد اس کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ "جب ہم اپنی قوم کی مجموعی محنت کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو سب سے پہلے اس امر کی طرف ہماری توجہ کھنچتی ہے کہ حصول معاش اور محنت کے متعلق اطمینان کی حالت نہیں ہے سب کے سب محنت پیشہ لوگ عموماً ایسے ہی ہیں جو صرف ہفتہ وار تنخواہیں پانیوالے ہیں۔ اور ہماری قلیل زراعت پیشہ آبادی میں مالکان زمین کی نسبت نہایت ہی کم ہے۔ اسکے ساتھ فرانس کا مقابلہ کرو جہاں قریباً نصف آبادی زمین کے ساتھ مالکانہ تعلق رکھنے والی ہے اور اس لیے انکو اپنی معاش کی نسبت اطمینان حاصل ہے۔ یہ زراعت پیشہ مالکان اراضی خواہ غریب ہوں مگر انکی نوبت افلاس سے اس درجہ تک ہرگز نہیں پہنچی کہ وہ ہر وقت فاقہ کے خطرے میں ہوں۔ اور کم از کم آزادی کی خوشی تو انہیں حاصل ہے۔" یاد رکھنا چاہیئے کہ فرانس میں اکثر لوگوں کا مالکان اراضی میں داخل ہونا خواہ وہ اراضی تھوڑی تھوڑی ہی ہو اسوجہ سے ہے کہ وہاں یہ نہایت ہی لغو قاعدہ جسکے رو سے کل کی کل جائداد از قسم اراضی بڑے لڑکے کے قبضہ میں آجاتی ہے مدت سے متروک ہوچکا ہے۔ اور اب وہاں ترکہ زمین کی تقسیم اصولاً اسلامی قانون وراثت سے ملتی جلتی ہے۔ اور یہی حال دیگر عیسائی ممالک کا ہے۔ کہ وہاں بھی اس قاعدہ کو ترک کرکے ایسا قانون

وُرثہ جاری کیا گیا ہے جو اصولاً اسلامی قانون سے ملتا ہے۔

نہ صرف اکثر ممالک یورپ میں ہی یہ قاعدہ اکہ کُل ورثہ بڑے لڑکے کو دیا جاوے متروک ہو چکا ہے بلکہ خود انگلستان میں جہاں ابتک یہ نامعقول رواج چلا جاتا ہے اب بہت سے لوگ اس کی موقوفی کے لیے زور دے رہے ہیں اور اصل میں تو جب سے یورپ وسطی زمانوں کی تاریکی سے نکلا ہے اسی وقت سے اس نے اس رواج کی لغویت اور نامعقولیت کو خوب سمجھ لیا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ یہ رواج کسی قوم نے سوچ سمجھ کر اختیار نہیں کیا بلکہ نہایت قدیم زمانہ کی بعض توہم پرستیوں کا یہ بقیہ ہے۔ اور عقل نہیں بلکہ جہالت کا ورثہ ہے جس کو ابتک بعض لوگ چھوڑ نہیں سکتے۔ اور زیادہ تر افسوس اُنپر ہے جن کو انکے دین نے ایک پاکیزہ اصل اس نامعقول رواج کی بجائے بتایا اور پھر وہ اسی جاہلیت کے زمانہ کی طرف عود کر کے اس وحشیانہ رواج کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں اس رواج کی اصلیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے "منو کے قوانین میں یہ ذکر ہے کہ سب سے بڑے بیٹے کی زندگی کی اصل غرض ہی یہی تھی کہ مذہبی رسوم کو ادا کرے اور اپنے مرے ہوئے بزرگوں کی روحوں کے لیے دعوتیں تیار کرے اس قانون کے مطابق دعا کے پڑھنے کا حق اسی کا ہے جو سب سے پہلے دنیا میں آتا ہے۔ اور ہر آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنے بڑے بھائی کو اپنے باپ کے برابر سمجھے۔ سب سے پہلا لڑکا دنیا میں لانیکے ذریعہ سے باپ اس حق کو ادا کرتا ہے جو اس کے بڑوں کی طرف سے اس کے ذمے ہے۔ اور اس لیے تقسیم سے پہلے بڑے بیٹے کو ہی کل ترکہ کا انتظام کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ اس عام رواج کی معلوم ہوتی ہے۔ کہ بڑا بیٹا ورثہ کے طور پر گھر کا سامان یا مکان وغیرہ لے لیوے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں میراث وہی شخص لیتا ہے جو مذہبی طور پر متوفّی کے متعلق رسوم کو ادا کرے"۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلامی قانون وراثت ایسے معقول اور قرین انصاف اصل پر مبنی ہے کہ تمام مغربی عیسائی اقوام کو سوائے ایک آدھ کے اس اصل پر اپنے قانونوں کی بنا رکھنی پڑی ہے۔ اور ان لوگوں کے لیے جو مہذب مسلمان کہلاتے ہیں یہ نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ وہ ان پاک اصول کو جن کی صداقت دنیا اپنے طرز عمل سے تسلیم کرتی چلی جاتی ہے چھوڑ کر یورپ کے وحشیانہ وسطی زمانوں کے اصول پر قوانین تجویز کرتے ہیں۔ اور اس فہم پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے ترقی اور اصلاح کی تجاویز کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ سلطنت کے قیام اور مضبوطی کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر منقولہ جائداد بجائے تقسیم ہونے کے کل کی کل بڑے لڑکے کو دیجاوے سخت غلطی ہے۔ کیا اسلام نے کبھی اس رواج کو اختیار کیا؟ جو اس کی سلطنتیں صدہا سال تک ترقی کے اوج پر پہنچی رہیں اور کیا بلحاظ قوت سلطنت کے اور کیا بلحاظ علوم کی ترقی کے دنیا میں اپنی نظیر آپ ہی تھیں۔ اور پھر ان دنوں میں جن سلطنتوں نے اس نامعقول رواج کو چھوڑ دیا ہے کیا ان کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں یا وہ سلطنتیں زوال پذیر ہو گئی ہیں؟ محض حماقت کا خیال ہے۔ اور سچ بات یہی ہے کہ یہ رواج جو عقل اور انصاف دونوں کے خلاف ہے وحشیانہ زمانہ کے خیالات

بقایا ہے اور علم اور روشنی کی ترقی کے ساتھ خود ہی اکھڑ رہا ہے اور اکھڑ جائیگا۔ اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیں کہ اس
زمانہ میں جب یہ رواج یورپ میں عام تھا اس وقت اس کے وجود سے گورنمنٹوں کے صحیح اصول کو کوئی مدد پہنچی
اور اصول قوانین ریاست نے مضبوطی پکڑی تو کم از کم اس وقت اس کی ایسی کوئی ضرورت نہیں اور جس مرحلہ پر
یہ رواج کوئی فایدہ پہنچا سکتا تھا اب مغربی گورنمنٹیں بھی اس مرحلہ سے نکل چکی ہیں۔ اور اب بجائے ترقی میں ممد
ہونے کے یہ رواج گورنمنٹ کے صحیح اصول کی ترقی میں روک ہو رہا ہے جیسا کہ انگلستان کے ہوس آف لارڈس کی
کیفیت صاف بتا رہی ہے۔ باقی رہیں اسلامی سلطنتیں سو جن اصول پر اسلام کے مقدس بانی علیہ الصلوٰۃ
والسلام نے سچی اسلامی گورنمنٹوں کی بنیاد رکھی تھی اور جو اصول ابتدائی چار خلافتوں میں مدنظر رکھے گئے وہ اعلیٰ سے
اعلیٰ ترقی یافتہ گورنمنٹ کے اصول ہیں۔ اور ان کو رائج کرنیکے لیے کسی ایسے رواج کی کوئی ضرورت نہیں ہے جہانتک
بادشاہ کی مطلق العنانی پر روک کا سوال ہے میں دیکھتا ہوں کہ ان انگلستانی امرا سے جنپر ہمارے مہذب بھائی
اسقدر فخر کر رہے ہیں بدرجہا بہتر اسلامی علما تھے۔ جو بوجہ اپنی راستبازی اور تقوے اور علم اور لیاقت کے بادشاہ اور
رعایا دونوں کے نزدیک معزز تھے اور جو بڑے بڑے طاقتور بادشاہوں کو بے دھڑک اور بلا خوف لومۃ لائم قیمتی مشورے
دیتے تھے جن کی عزت بادشاہوں کے نزدیک ایسی تھی کہ وہ انکے مشوروں کو یونہی رد نہ کر سکتے تھے۔ اور جنپر عوام کو
اسقدر اعتبار تھا کہ ہر موقع پر انکی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ نہایت ابتدائی زمانہ اسلام میں جب تک صحابہؓ میں
سے بعض زندہ تھے یہ عزت ان کو حاصل تھی اور پھر اس قرن کے بعد دیگر معزز اور مقتدر علماء کو ہمیشہ شاہان وقت
کے دربار میں ایسا رسوخ حاصل تھا کہ وہ اکثر اوقات بعض جابر بادشاہوں کو انکی ظالمانہ کارروائیوں سے روکنے کا
ذریعہ ہوتے تھے۔ اس لیے اسلام کو ایسے امرا کی جو محض اپنی جائدادوں کی خاطر کوئی کارروائی کرنیوالے ہوں خواہ
عوام کا اس میں فایدہ ہو یا نقصان کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ اور سچ بات یہ ہے جس کو ہر ایک عقلمند تسلیم کرے گا
کہ بادشاہ کو ضرورت ہے صاحب علم اور راستباز اور دانا مشورہ کاروں کی کیونکہ جیسا فایدہ ان کے وجود سے سلطنت اور
رعایا کو پہنچ سکتا ہے اس کا عشر عشیر بھی امرا کے ذریعہ سے نہیں پہنچ سکتا۔

اخیر پر اسلامی قانون وراثت کا دوسرے قوانین وراثت سے مقابلہ کرنا خالی از فایدہ نہ ہوگا تاکہ اس سے اسلام کی
عظمت کا پتہ لگے کہ دنیا میں کس وقت اور کس ملک میں پیدا ہو کر کیسی حیرت انگیز اصلاح اس مذہب نے کی۔ ایک پہلو
اس مقابلہ کا عورتوں کے حقوق کے متعلق ہے۔ اسلامی قانون کی تشریح اوپر ہو چکی ہے۔ اب اگر عرب کی حالت کو
دیکھیں جہاں اسلام پیدا ہوا اور جہاں اس کی ابتدائی ترقی ہوئی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں اس ملک کی
ایک نہایت ہی ذلیل حالت تھی۔ عورتوں کو ورثہ دینا تو ایک طرف رہا وہ عورتوں کو ترکہ میں شامل کرتے اور بیٹے
اپنے باپوں کی بیویوں کو اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ جس بد رسم کو دور کرنیکے لیے قرآن کریم کو یہ حکم دینا پڑا کہ تمھاری

مائیں تم پر حرام کی جاتی ہیں۔ یہ تو عرب کی حالت تھی۔ اور یہودیوں میں بھی اسی کے قریب قریب رسوم جاری تھیں۔ حضرت موسیٰ کی شریعت نے یہ اصلاح ان رسوم میں کی تھی کہ جہاں کسی کے ہاں کوئی لڑکا نہ ہو تو اس وقت لڑکی کو میراث کا حصہ ملتا تھا۔ مگر لڑکی پھر بھی لڑکوں کے ساتھ ورثہ کا حصہ نہ لے سکتی تھی۔ عیسائیوں کا اپنا قانون کوئی نہ تھا۔ ابتدا میں تو وہ شریعت موسوی پر عمل کرتے تھے۔ مگر عیسائی مذہب کے پھیل جانے پر ان لوگوں نے یہ طریق اختیار کر لیا تھا کہ جس ملک میں ہوں وہیں کی رسوم اختیار کر لیں۔ رومی اسوقت کی دنیا میں سب سے زیادہ مہذب کہلاتے تھے۔ اور اگرچہ ان کے قانون کے رو سے بعض حالتوں میں لڑکی ورثہ پا سکتی تھی مگر یہ قانون ایسا پیچدار تھا کہ عملی طور پر وہ کوئی حصہ نہ لے سکتی تھی۔ جو لڑکی باپ کی زندگی میں ہی بیاہی جاتی اسکا تو قطعاً میراث میں کوئی حق نہ تھا ہاں جو ابھی بیاہی نہ گئی ہو قانوناً اُسے حقدار سمجھا جاتا تھا بشرطیکہ باپ وصیت کے رو سے اسے محروم الارث نہ کر گیا ہو۔ مگر اس کے ساتھ بھی سخت قیود اور پابندیاں تھیں۔ کیونکہ لڑکی بغیر مرد رشتہ داروں کی رضامندی کے کوئی قیمتی حصہ جایداد کا الگ نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی اسے وصیت کرنے کا کوئی حق تھا۔ خواہ اس کے رشتہ دار مرد رضامند ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ تھی عورتوں کے حقوق کی حالت عرب اور عجم میں جب اسلام نے قدم دنیا میں رکھا۔ تو یکرتبہ ہی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے حقوق وراثت وصیت اور قرضہ لینے دینے کے معاملات میں غرض ہر طرح کے حقوق حصول جائداد میں مرد اور عورت کو ایک ہی سطح پر کر دیا۔ یہ عظیم الشان اصلاح خصوصاً جب کہ ان حالات کو مدنظر رکھا جائے جو اس سے پہلے دنیا میں تھے بجائے خود ایک قطعی شہادت اسلام کے منجانب اللہ ہونے پر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے فروعی مسائل بھی اپنے اندر ایک ایسی شہادت رکھتے ہیں جس سے ایک غور کرنیوالی طبیعت معاً اس نتیجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ اس کے قوانین ایک اُمّی عرب کے دماغ سے نہیں نکلے۔ علاوہ اس اصلاح کے جو قانون وراثت میں اسلام نے کی اور بھی بہت سے پہلو اس قانون کے ایسے ہیں جو اسلام کی فضیلت کو ثابت کر رہے ہیں۔ اسلام نے کسی ایسے شخص کو جو قدرتی طور پر وارث سمجھا جا سکتا تھا ورثہ سے محروم نہیں کیا۔ اور سب کو تھوڑا تھوڑا حصہ دیدیا اور پھر اس بات کو کہ کوئی شخص اس کو اپنی محنت سے ترقی دیکر بڑھا لے یا اپنی سستی سے گھٹا دے انسان کی اپنی کوشش پر چھوڑ دیا۔ مگر اس قسم کا ظلم روا نہیں رکھا کہ ایک وارث تو سب کچھ لے جائے اور دوسرے بالکل محروم کیے جاویں۔ عیسائی مذہب کا میلان ابتدا میں اس طرف تھا کہ تمام انسانوں میں مال و دولت برابر تقسیم ہو۔ مگر یہ عملی طور پر دنیا میں نہ کبھی ہوا نہ ہوگا اور نہ عیسائیت ہی اسکو کر سکی۔ پس اسلام نے ایک ایسا درمیانی راہ اختیار کیا جو قابل عمل بھی ہے اور جس پر عمل ہو رہا ہے اور ساتھ ہی اس سے دولت کی تقسیم ایسے طور پر ہوتی رہتی ہے کہ سب کو کچھ نہ کچھ حصہ ملتا جائے دوسرے قوانین کی رو سے جو اصولاً اسلامی قانون وراثت کے مخالف ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کل مال ایک ایسے شخص کو

ملجاتا ہے جو بالکل نالایق ہے اور لایق اور اہل لوگ خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ اسلام نے اس طریق کو پسند نہیں کیا بلکہ ہر ایک کو خواہ وہ محنتی ہو یا آرام طلب برابر حصہ دیکر اس کا بڑھانا یا ضایع کرنا اسکی اپنی کوشش یا سستی پر چھوڑ دیا ہے*۔ اور اسطرح پر یہ ترغیب دی ہے کہ لوگ محنت کریں اور سستی اور کاہلی سے بچیں۔ یہ بھی ایک خاص خوبی اسلامی قانون وراثت کی ہے۔ کہ وہ لوگوں کو محنتی بناتا ہے۔

* نابالغ اور کم عقل لوگوں کے لیے جو علم سے کورے ہیں اُن کا مال متولیوں کے ہاتھ میں رہتا ہے اور وہ صرف بقدر ضرورت خرچ کرتے ہیں۔ منہ

# آخرت سے متعلق دہریوں کے خیالات

۲۶۔ مئی سنہ ۱۹۰۶ء کے اخبار اگناسٹک جرنل میں آیندہ زندگی کے متعلق چند دہریوں کے خیالات شایع ہوئے ہیں جن سے مفصلہ ذیل اقتباس کیے جاتے ہیں۔ ایک دہریہ لکھتا ہے۔ کہ "زندگی مابعد الموت کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور اسکا مطلق ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہم توہم پرستی اور خوف کی زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہیں اس لیے ہم ابدی دوزخ اور قادر مطلق شیطان کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے عقاید جہالت اور خوف کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے نزدیک انسان کی زندگی محض اسی دنیا کی زندگی ہے۔ انسان کبھی یہ پیشگوئی کرنیکا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آج شام کو موسم کیا ہوگا یا اسکے بعد جو رات آنیوالی ہے اسکی کیسی حالت ہوگی۔ نہ ہی قبل از وقت وہ ان حالتوں کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ چھوٹی سی بات بھی کہ آیا رات کو چمکدار ستارے آسمان پر نکلیں گے یا ابر محیط ہوگا اس کے علم سے باہر ہے۔" ایک اور دہریہ لکھتا ہے کہ "دہریت میں ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ آیندہ زندگی ایک بالکل ناممکن امر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس آیندہ زندگی کی حالت کے واقعات کو معین کرنا چاہے کہ وہاں ہمارے نورانی اجسام ہوں گے اور ہم آسمانوں میں رہیں گے اور گیت گائیں گے۔ اور کھجور کی ٹہنیاں ہلائیں گے تو ہم فی الفور یہ جواب دیں گے کہ ان ادعاؤں کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں ہو سکتا اور ایک حصہ ایسا ہے جو ہمارے علم کے رو سے محال ہے۔ یہ محض توہم پرستی اور جہالت کا نتیجہ ہے جو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ پردہ جو زندوں اور مردوں کے درمیان ہے اُٹھا دیا جاوے تو ہم ان روحوں کو دیکھ لیں گے جنکا کام میزوں کو اٹھانا اور لغو اور بےمعنی باتیں کرنا ہے*" ایمرسن کہتا ہے کہ "اس سوال کی نسبت کہ کسقدر عرصہ ہم رہیں گے یہ سوال زیادہ ضروری ہے کہ ہم کس قابل ہیں۔ اور جو آیندہ بڑا آدمی ہونا چاہتا ہے اسکو ابھی بڑا بننا چاہیے۔"

* جو اشارہ یورپ کے سپریچولسٹوں کی طرف ہے جو روحوں کی طرف ایسے لغو کام منسوب کرتے ہیں۔ منہ

میں ان تین راؤں کو جو آیندہ زندگی کے متعلق ہیں عام دہریہ خیالات کے نمونہ کے طور پر لیتا ہوں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگناسٹک لوگ آیندہ زندگی کے امکان کا انکار نہیں کرتے بلکہ صرف اس کا ثبوت چاہتے ہیں۔ اور ثبوت بھی اس قسم کا ہو کہ آیندہ زمانہ میں جو بعض واقعات انسان کو اسی زندگی میں پیش آنیوالے ہیں اسکا علم انسان کو ہو سکے تا کہ یہ شہادت ہو اس امر کی کہ واقعی زندگی بعد الموت کے متعلق انسان کو کچھ علم ہو سکتا ہے کیونکہ اگر کوئی انسان اس زندگی کے متعلق آیندہ کی کچھ بھی خبر نہیں دے سکتا تو زندگی بعد الموت کے متعلق جو اسقدر دور کی خبر ہے وہ کیونکر کچھ کہہ سکتا ہے۔ ایسا ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم آیندہ زندگی کے متعلق کوئی تفصیل نہیں معلوم کر سکتے اور اسکو بھی وجہ انکار ٹھہرایا گیا ہے چوتھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ہمیں آیندہ زندگی کی نسبت اس زندگی کا زیادہ فکر کرنا چاہیئے۔ جو اصل میں صرف آیندہ زندگی کے انکار کا نتیجہ ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ یہ انکار محض عیسائی مذہب کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ خود راقم مضمون مذکور لکھتا ہے کہ "اس سے زیادہ تعجب خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان کے لیے خودکشی سے یا دوسروں کے قتل کے ذریعہ ابدی زندگی کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔" مگر تاہم ان عقاید کے انکار کے ساتھ جو عیسائی مذہب نے سکھائے ہیں ان صداقتوں کا بھی انکار کر دینا جو ایک دانا آدمی ان غلطیوں کے نیچے صاف دیکھ سکتا ہے عقلمندی کا کام نہیں ہے کیونکہ ان شہادتوں کے علاوہ خود فطرت انسانی آیندہ زندگی پر اپنے اندر ایک شہادت رکھتی ہے۔ کیونکہ ایک جھوٹے عقیدہ کو نہ صرف عقل ہی دھکے دیتی ہے بلکہ فطرت انسانی بھی اسکو قبول نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ ایک مذہب کے پیرو ایک غلط عقیدہ پر ایک وقت تک قایم رہیں مگر ایسا عقیدہ دنیا میں عام طور پر مقبول نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ عقیدہ کہ ایک آدمی کے مصلوب ہونے سے کروڑوں انسان جو گناہوں میں سر تا پا غرق ہیں گناہ سے نجات پا کر ابدی زندگی میں داخل ہو گئے اور کروڑوں راستباز محض اسکی صلیب کا انکار کرنیکی وجہ سے جہنمی ہو گئے ایک ایسا لغو عقیدہ ہے کہ نہ صرف عقل انسانی ہی اسکو دھکے دیتی ہے بلکہ فطرت انسانی بھی اسکو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور ایک ایسے لغو عقیدہ کا ثبوت طلب کرنیکی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن فطرت انسانی مابعد الموت زندگی کا ایسے طور سے انکار نہیں کرتی اور اسکا انکار محض اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اسکا ضروری ثبوت منکرین کو نہیں دیا گیا۔ ساتھ ہی جب ہم اس پہلو پر نظر ڈالتے ہیں کہ عام طور پر دنیا نے نہایت قدیم زمانے سے آجتک کیونکر مابعد الموت زندگی کی ضرورت کا احساس کر کے اسے تسلیم کیا ہے۔ تو یہ مضبوط شہادت جو فطرت انسانی دیتی ہے اس بات کے ثابت کرنیکے لیے کافی ہے کہ بیشک زندگی بعد الموت ایک امر واقع ہے۔ پس یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ دوسری شہادتوں کو چھوڑ کر خود آیک ذریعہ شہادت کا ہی ایسا ہے جو اکثر مسائل مثلاً ہستی باریتعالیٰ ضرورت نبوت زندگی بعد الموت وغیرہ کو ثابت کرتا ہے۔

جن خیالات کا اظہار دہریہ لوگوں نے اوپر کیا ہے اور جس قسم کا وہ ثبوت طلب کرتے ہیں اس سے انکار کرنا گویا ایسا ثبوت دینے سے اپنی ناقابلیت ظاہر کرنا ہے۔ کیونکہ اگر واقعہ میں کوئی انسان بھی دنیا میں ایسا نہیں جس کو اس زندگی میں آیندہ کے

متعلق کسی قسم کی اطلاع نہ دیجاتی ہو تو پھر یہ امر سخت مشتبہ ہو جاتا ہے کہ زندگی بعد الموت کے متعلق جو ایک غیب در غیب اور نہایت ہی پوشیدہ امر ہے کوئی شخص خبر دے سکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں زندگی بعد الموت کا دعویٰ نرا دعویٰ ہی دعویٰ رہ جاتا ہے جس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں۔ عیسائی صاحبان اسبات کا انکار تو نہیں کر سکتے پر وہ اسکا جواب یہ دیتے ہیں کہ اسطرح پر آئندہ کی خبریں صرف حضرت مسیحؑ اور انکے حواریوں کو دی جاتی تھیں اور اس کے بعد یہ دروازہ بند ہو گیا۔ اب ایک طرف تو معقولی رنگ میں یہ امر سخت قابل اعتراض ہے کہ کیونکر اللہ تعالیٰ کی ایک قدیم سُنّت ایک خاص زمانے میں آکر بند ہو گئی۔ اور دوسری طرف حضرت مسیحؑ اور حواریوں کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا کوئی بھی تاریخی ثبوت ہمارے ہاتھوں میں نہیں جس سے ایک بیرو رعایت آدمی کو قائل کیا جاسکے۔ پس دراصل عیسائی صاحبان کے ہاتھ میں کچھ بھی ثبوت زندگی بعد الموت کا نہیں ہے۔ ہاں ایک مذہب اسلام ہے جس کے رو سے نہ معقولی رنگ کا اعتراض وارد ہوتا ہے اور نہ ہی تاریخی ثبوت پر کوئی شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام میں نہ صرف اس زمانہ میں ہی ایسے افراد موجود ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے نہاں در نہاں غیب کی خبریں ظاہر کرتا ہے اور ایسے افراد کا وجود قریباً ہر زمانے میں ہی رہا ہے۔ بلکہ اسلام کی تاریخ کے ہر مرحلہ پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیکڑوں برسوں کی پیشگوئیاں پوری ہو کر اسکی صداقت کو روشن کرتی رہی ہیں۔

غیب کے متعلق بحث میں دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ غیب کی کسی خبر کا جان لینا معمولی طور پر انسان کی طاقت کے اندر نہیں ہے۔ چنانچہ انسان کی اس عاجزی کا اعتراف خود دہریہ لوگوں نے بھی کیا ہے اور اسطرح پر یہ بات مسلّم الثبوت ہو گئی۔ دوسرا امر یہ ہے کہ غیب کا ایسا علم اللہ تعالیٰ حجت کے طور پر بعض وقت اپنے خاص اور برگزیدہ بندوں کو جنکو وہ دنیا کی اصلاح کے لیے مامور فرماتا ہے دیدیتا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں پر اتمام حجت کر سکیں کہ جو باتیں وہ بعد الموت زندگی کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ وہ راست ہیں۔ اس دوسری بات کا ثبوت تمام انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم بھی اسی امر کی شہادت دیتا ہے جیسا کہ سورۃ الجن میں فرماتا ہے۔ عالم الغیب فلا یظہر علیٰ غیبہ احداً الا من ارتضیٰ من رسول۔ یعنی غیب کی نہاں در نہاں خبروں کو جاننے والی وہی ذات پاک ہے۔ جو اپنے غیب کا اظہار سوائے اپنے برگزیدہ رسولوں کے اور کسی پر نہیں کرتا۔ یہاں وہی دو باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ یعنی یہ کہ معمولی طور پر انسان سخت عاجز ہے کہ وہ غیب کی بات پر اطلاع پاسکے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ رسولوں پر اس لیے ایسی غیب کی خبریں ظاہر کرتا ہے کہ تا ان باتوں کا پورا ہونا آخرت کے متعلق یقین تمام دلوں میں پیدا کرے۔ افسوس ہے کہ یہ موقع اسقدر گنجایش نہیں رکھتا کہ میں اسلام کی ان عظیم الشان پیشگوئیوں کا تذکرہ

کرسکوں جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طیّب زندگی کے ایک حصّہ میں شایع کیں اور اسی زندگی کے دوسرے حصّہ میں پوری ہوئیں یا ان پیشگوئیوں کو مفصل بیان کرسکوں جو آپ نے کیں اور جن کو پورا ہوتے آپ کے صحابہؓ نے آپ کے بعد دیکھا۔ یا ان پیشگوئیوں کو بیان کرسکوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیں اور پھر وہ حدیث کی کتابوں میں لکھی جاکر شایع ہوگئیں اور پھر ان کو پورا ہوتے ایک دنیا نے دیکھا۔ اور وہ ہر زمانہ میں پوری ہوتی رہیں۔ یہانتک کہ آج آپ سے تیرہ سو سال بعد نہایت صفائی سے پوری ہورہی ہیں اور اسلام کے پاک چہرہ کو روشن کرکے دکھلارہی ہیں۔ نہ ہی اس جگہ یہ گنجایش ہے کہ میں ان عجیب درعجیب پیشگوئیوں کا ذکر کروں جو آپ کے ایک سچے متبع پر اس زمانہ میں ظاہر کی گئیں اور پوری ہوئیں اور ان پر لاکھوں انسان گواہ ہوئے کیونکہ وہ پیشگوئیاں ساٹھ کی ساٹھ پوری ہونے سے کچھ عرصہ پہلے بذریعہ کتب و اخبارات شایع ہوتی رہیں۔ اور آخر نہایت صفائی سے پوری ہوئیں۔ ہاں اس قسم کی بعض پیشگوئیوں کا تذکرہ وقتاً فوقتاً اس رسالہ میں ہوتا رہا ہے اور جو صاحب چاہیں ان کو دیکھ سکتے ہیں۔

مگر ایک امر کو جو اسلام کی صداقت پر ایک نہایت ہی روشن دلیل ہے میں اس جگہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے فطرت انسانی کا کسقدر گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور کسطرح پر ایسے ایسے ثبوت اپنے دعووں کی تائید میں پیش کیے ہیں۔ جن کی ٹوہ میں انسانی فطرت لگی رہتی ہے۔ یہ قرآن کریم کی ایک ایسی خوبی ہے جس کی نظیر ہم دوسرے مذاہب میں کہیں نہیں پاتے۔ اور یہ منجملہ عظیم الشان خصوصیات اسلام کے ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ آخرت کے متعلق جو ثبوت قرآن شریف نے پیش کیا ہے۔ وہ بعینہٖ دہریوں کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ جب انسان اس زندگی کے ادنیٰ سے واقع کی نسبت پیش از وقت خبر نہیں دے سکتا۔ تو وہ آیندہ زندگی کی دقیق در دقیق کیفیات کے متعلق کیونکر ہمیں کوئی علم دے سکتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب قرآن کریم نے یوں دیا ہے کہ وہ جہاں آخرت کے متعلق مومنین کو خوشحالی اور کافرین کو دُکھ کی زندگی کی خبر دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس دنیا میں بھی مومنین کے لیے بعض وعدے اور کافروں کے لیے بعض وعید بیان فرماتا ہے۔ جس سے غرض اس پاک کتاب کی یہ ہے کہ تا اِس زندگی کی خبروں کو پورا ہوتے دیکھکر آخرت کے متعلق یقین تام دلوں میں پیدا ہو یعنی مثلاً قرآن شریف یہ خبر دیتا ہے کہ مومنوں کے لیے آخرت میں ایک راحت کی زندگی ہوگی اور ان کو جنّت میں جگہ دیجاویگی اور ساتھ اس کے بطور ثبوت یہ بیان فرماتا ہے کہ اس زندگی میں بھی وہ کامیاب اور خوشحال کیے جائینگے اور اس دنیا کی جنتوں پر قابض کیے جاویں گے۔ امر دویم جو اس زندگی سے متعلق ہے اس کا سچا یا جھوٹا ہونا اسی زندگی میں کھل سکتا ہے۔ اور کھل گیا۔ پس جب ان دو خبروں میں سے جو مومنوں کو انکی آیندہ زندگی کے متعلق دیگئی تھیں وہ خبر جو اس زندگی کے متعلق تھی نہایت صفائی سے پوری ہوگئی تو اس دوسری خبر کی نسبت بھی

کہ آخرت میں انکو کیا کیا مراتب ملیں گے کوئی شک باقی نہ رہا۔ اور اخروی زندگی کی خوشحالی کا قطعی ثبوت مل گیا ایسا ہی کافروں کیلیے قرآن کریم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ انکو آخرت میں جہنمی زندگی نصیب ہوگی۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی پیشگوئی کی کہ اِس زندگی میں بھی وہ مسلمانوں کے سامنے ذلیل اور ناکام کیے جائیں گے اور دکھوں کا مزہ چکھیں گے۔ پس اِس دنیا کے وعدے کو صریح طور پر پورا کر کے آخرت کے وعدے کی سچائی کو ثابت کردیا۔ اصل میں یہی ایک سچا طریق ہے جس سے زندگی بعد الموت اور جنّت و دوزخ کا ثبوت ملتا ہے۔ اور مسلمان جسقدر اس کتاب پر جو انکو دیگئی ہے فخر کریں تھوڑا ہے۔ کیونکہ انکے ہاتھ میں وہ زریں اصول دیے گئے ہیں جو ہر قسم کے اعتراضات سے خالی اور ہر قسم کے شبہات سے پاک ہیں۔

تیسری بات جو دہریوں کے اقوال مذکورہ بالا سے پیدا ہوتی ہے یہ اعتراض ہے کہ آیندہ زندگی کا تفصیلی علم نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے متعلّق میں دو باتیں کہنی چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ قرآن کریم نے جسقدر ضرورت سے اُسقدر تفصیلات ہمیں خوب سمجھادی ہیں۔ مثلاً ضرورت ہمیں یہ جاننے کی ہے کہ کس قسم کے اعمال پر کس قسم کی جزا و سزا آیندہ زندگی میں مترتب ہوگی سو اس کے متعلق قرآن کریم نے نہایت بسط اور وضاحت سے اپنے منشاء کو بیان فرمادیا ہے۔ کہ جزا و سزا انہیں اعمال کا ثمرہ ہوگی۔ اس سے زیادہ تفصیلات کے جاننے کی اس زندگی میں ہمیں کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جہانتک اِس زندگی کا اُس زندگی سے تعلق ہے وہ اور کسی قسم کی تفصیلات کا محتاج نہیں۔ ہمارے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ اگر ہم ایسے عمل کریںگے جو اللہ تعالیٰ کی نارضامندیکا موجب ہیں اور اس ذات پاک سے ہمارے تعلق کو کم یا قطع کرنے والے ہیں۔ تو ان اعمال کے ثمرات بھی دردوں اور دکھوں کے رنگ میں ظاہر ہوں گے۔ ہمارے اعمال پر اگر کوئی اثر ہو سکتا ہے تو انہیں دو باتوں کے جان لینے سے ہو سکتا ہے۔ جو بطور اصول حیات بعد الموت کے ہیں۔ باقی رہیں زاید تفصیلات سو انکی ہمیں اس دنیا میں جاننے کی کوئی حاجت نہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ اُس زندگی کا رنگ اِس زندگی سے بالکل نرالا ہے یہانتک کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جنّت کی نعماء ایسی ہیں کہ اس دنیا کی نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی دل میں انکا خیال گذرا پس ایسی تفصیلات کو اسی دنیا میں حل کرنیکا خیال کرنا بے فایدہ ہے۔ انکی پوری پوری کیفیّات سمجھنے کے لیے وہی عالم ہے جہاں وہ نعماء یا آلام محسوس اور مشہود ہوں گے۔ ہاں قرآن کریم نے ان تفصیلات کو بھی بیان ضرور فرمایا ہے اور یہ حقایق قرآن کریم کے جو آخرت کے متعلق ہیں اُسی عالم آخرت میں ہی کھلیں گے۔ اس امر کی شہادت ہمیں اس بات سے بھی ملتی ہے کہ جسقدر کوئی شخص روحانیت اور راستبازی میں ترقی کرتا ہے اور اس سفلی دنیا سے اپنے تعلّقات کو قطع کرتا ہے اسیقدر زیادہ معارف اور حقایق قرآن کریم کے اُسے سمجھائے جاتے ہیں جیسا کہ خود قرآن شریف فرماتا ہے کہ لا یمسہ الا المطھرون یعنی

قرآن کریم کا سمجھنا صرف اعلیٰ دماغی قوٰے پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے معارف اور حقائق کے عجیب و غریب خزانے اس شخص پر کھولے جاتے ہیں جو تقویٰ اور راستبازی اختیار کرتا ہے اور جس کے دل کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نے ہر ایک گند سے پاک اور صاف کر دیا ہے۔ پس جس صورت میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسی عالم میں روحانیت کی ترقی کے ساتھ قرآن کریم کے معارف عالم آخرت کے متعلق زیادہ کھولے جاتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس بہشتی زندگی میں جو مومنوں کو موت کے بعد دیجائے گی اُس کی کُل تفصیلات ان نعمائے کے متعلق سمجھ آجائیں گی۔ جس صورت میں ہم اِسی دنیوی زندگی کو منتہائے ترقی انسانی نہیں سمجھتے اور کہتے تو یہ ہم کیونکر مان سکتے ہیں کہ یہ زندگی منتہائے علم انسانی ہو جائے۔ بلکہ ہمارے نزدیک جس طرح بہشتی زندگی تدریجی اور غیر متناہی ترقیات کی جگہ ہے اسی طرح اُس زندگی میں انسان علم کی غیر متناہی ترقی کے بھی مراتب حاصل کرتا جاویگا۔

امر چہارم کے متعلق کہ ہم کو اخروی زندگی کی نسبت اِس دنیا کی زندگی کی زیادہ پروا کرنی چاہیئے۔ مَیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل میں تو اس وقت عیسائی اقوام کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بکلی مردار دنیا پر گر پڑے ہیں۔ ہاں فرق صرف اسقدر ہے کہ ایک دہریہ جرأت سے اس بات کو کہدیتا ہے جو اس کا عقیدہ ہے اور عیسائی صاحبان بُزدلی سے اصل بات کا اقرار نہیں کرتے اِس زندگی کو آخرت یا دنیا کو دین پر مقدم کرنیکی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس زندگی کی نعماء اور دنیوی فوائد تو مشہود اور محسوس ہیں مگر آخرت پر ایمان اسقدر کمزور ہے کہ اس کی کشش بمقابلہ دنیوی کشش کے کچھ بھی نہیں۔ پس یہ مرض اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ آخرت کے متعلق ایسا یقین تام پیدا نہ ہو جو دنیوی کشش پر غالب آجائے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ دین کو دنیا پر مقدم کرنے یا اخروی زندگی کا اِس دنیا کی زندگی کی نسبت زیادہ خیال رکھنے کا یہ منشا نہیں کہ لوگ راہبوں کی طرح دنیا کے کاروبار چھوڑ کر گوشہ گزین ہو جاویں۔ نہیں بلکہ اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ تم دنیا میں اپنے وجودوں کو مفید بناؤ۔ بلکہ اسلام کے نزدیک اِسی دنیا کی زندگی میں ہی انسان وہ ترقی حاصل کرتا ہے جو اس کی اخروی خوشحالی کا موجب ہے۔ پس انسان کو جو کچھ کرنا چاہیئے اسی دنیا کی زندگی میں ہی کرنا چاہیئے۔ دین یا آخرت کو مقدم کرنیکے معنے یہ ہیں کہ راستبازی اور تقوے کا خیال محض دنیوی آسائشوں کے حاصل کرنے پر مقدم کیا جاوے۔

---

# الٰہی سلسلے اور ارتداد

---

جب کبھی اللہ تعالیٰ دنیا کی اصلاح کے لئے کسی نبی کو مامور فرما کر بھیجتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے مخلص مومنین کی

ایک جماعت کو اکٹھا کرتا ہے۔ تو ساتھ ہی بعض ایسے لوگ بھی خدائی جماعتوں میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے ایمان کچے اور دل کمزور ہوتے ہیں۔ پھر یا تو یہ لوگ مامور سے تعلق پیدا کر کے اپنے ایمان کو مضبوط کر لیتے ہیں اور یا اگر انہوں نے مامور سے سچا تعلق پیدا نہیں کیا تو اس شاخ کی مانند جو تنے کے ذریعہ جڑ سے غذا حاصل نہیں کرتی آہستہ آہستہ خشک ہو کر کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور ایک جماعت ایسی بھی ہوتی ہے جو منہ سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر انکے دلوں میں نور ایمان نے جگہ پیدا نہیں کی ہوتی اور نہ وہ ان ہدایتوں پر چلتے ہیں جو مخلص مومنین کو خدا کی راہ میں ترقی کرنیکے لیے بتائی جاتی ہیں۔ گویا مخلص مومنین کے علاوہ ایک جماعت مرتدین کی اور ایک جماعت منافقین کی ہوتی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے کہ ہر ایک الٰہی سلسلے میں ان دو قسموں کے اشخاص بھی پائے جائیں گے اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور کیوں اللہ تعالیٰ نبی کے ساتھ صرف ایسے لوگوں کو شامل نہیں کرتا جو کبھی ڈگمگانے والے نہ ہوں یا کیوں نبی کی تعلیم ان تمام لوگوں پر جو ایک دفعہ اس کے پاس آجائیں اور اسکو مان بھی لیں ایسا اثر نہیں کرتی کہ حلاوت ایمانی سے ان کے دل بھر کر ان کو ایسے پختہ کر دے کہ کوئی ابتلا یا کوئی ایمانی کمزوری ان کو جنبش نہ دے سکے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ مامور کے زیر اثر آتے ہیں انہیں سے اکثر ایک غیر معمولی ایمانی ترقی دکھاتے ہیں اور خدا کی راہ میں قربانی کے ایسے نمونے ان سے ظاہر ہوتے ہیں جو دوسروں سے ہرگز نہیں ہو سکتے مگر یہ سب لوگ اپنی اپنی فطری استعداد کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہیں یعنی بعض ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ ایمانی ترقیاں حاصل کرتے ہیں اور روحانیت کے اعلیٰ مراتب طے کرتے ہیں بعض انسے کم علیٰ ہذا القیاس اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایمان لا کر پھر مرتد یا منافق بنجاتے ہیں۔ اور اس میں ایک یہ مصلحت الٰہی بھی معلوم ہوتی ہے کہ جیسا مامور من اللہ کے ہزار ہا دشمن بیرونی طور پر ہوتے ہیں جو اس کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ایسا ہی اللہ تعالیٰ یہ بھی چاہتا ہے کہ اندرونی طور پر بھی جو لوگ چاہیں اس سے کھلم کھلا یا چھپکر دشمنی کر لیں اور جتنی کوشش وہ اس کے نیست و نابود کرنیکے لیے کر سکتے ہیں کر لیں۔ تا آخر میں ان تمام بیرونی اور اندرونی دشمنوں کو ناکام اور نامراد کر کے اور مامور من اللہ کو ان سب پر غالب کر کے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا ہاتھ مامور من اللہ کی تائید میں کام کرتا ہوا دکھائے۔ اس لیے ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض وقت وہ لوگ جن کو ظاہر طور پر یعنی لوگوں کی نظروں میں مامور سے ایک گہرا تعلق ہوتا ہے وہ بھی مرتد ہو جاتے ہیں اور پھر دشمن خوشی کے مارے بغلیں بجاتے ہیں کہ اب یہ سلسلہ تباہ ہو جائیگا مگر اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کے باوجود مامور کو محفوظ رکھتا اور اس کے سلسلے کو ترقی دیتا ہے اور کوئی بات خواہ وہ ابتدا میں اس سلسلے کے لیے کیسی ہی خطرناک معلوم ہو۔ دراصل صرف اس سلسلے کے لیے کھاد کا کام دیتی ہے اور اس کی ترقی اور نشوونما کا ذریعہ بنجاتی ہے۔

مذہبی تاریخ کے مطالعہ کرنیوالے پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بہت سے

لوگ بنی اسرائیل سے مرتد ہو گئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی بہت سے مرید اُن کے مرتد ہو گئے یہانتک کہ ایک ہی دن میں پانچسو کا مرتد ہوجانا بھی معلوم ہوتا ہے اور پھر انکا خاص الخاص مرید یہودا اسکریوطی جو آپ کا خزانچی بھی تھا مرتد ہوگیا اور ایسا سخت مرتد ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کو پولیس کے ہاتھ میں اس نے گرفتار کروا دیا۔ ایسا ہی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی کئی لوگ مرتد ہو گئے تھے جن میں سے ایک عبد اللہ بن ابی سرح کاتب الوحی تھا جس خبیث کے دل میں یہ وسوسہ شیطانی گذرا تھا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے پاس سے وحی بناکر لکھوا دیتے ہیں اور کہ یہ وحی کچھ بھی چیز نہیں۔ ایسا ہی ابن خطل۔ عبد اللہ بن جحش وغیرہ دوسرے لوگ تھے اور منافقین کی بھی ایک جماعت تھی مگر خدائے تعالیٰ نے ان سب مرتدین کا مونہہ کالا کیا۔ اور وہ کس مپرسی کی حالت میں مرے۔ مسیلمہ کذاب بھی مرتد تھا چنانچہ پہلے اس کا اسلام لانا بھی ثابت ہے۔ اسی سُنّت الٰہی کے مطابق سلسلہ احمدیہ میں بعض لوگ مرتد ہو گئے ہیں جس پر اس سلسلہ کے دشمنوں نے بڑی خوشیاں منائی ہیں کہ اب یہ سلسلہ تباہ ہو جائیگا مگر سُنّت الٰہی سے ناواقف لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ایسے ارتداد سے ایک سچے سلسلہ کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ کیونکہ جس کو خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا انسان اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ منجملہ ان مرتدین کے ایک ڈاکٹر عبد الحکیم ہے جس کا ارتداد ہنوز تازہ ہے۔ اس ارتداد پر بعض لوگوں نے تو یہانتک غلو کیا ہے کہ یہ اس سلسلہ کے نعوذ باللہ باطل پر ہونیکا ثبوت ہے اور اپنے اس باطل دعوے کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ ہرقل کے سامنے ابوسفیان نے یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں میں سے کوئی شخص مرتد نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ تدبّر سے کام نہیں لیتے۔ جو شخص قرآن شریف کو غور سے پڑھے گا وہ ایسی لغوبات مونہہ سے کبھی نہیں نکال سکیگا خواہ اسے تاریخ سے واقفیت ہو یا نہ ہو۔ اگر کوئی بھی مرتد نہ ہوتا تو مرتدین کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں احکام کیوں بیان فرماتا۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاؤلٓئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاٰخرۃ واؤلٓئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون۔ (البقرۃ - ۲۱۸) اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے برگشتہ ہوگا اور کفر ہی کی حالت میں مرجائیگا۔ تو ایسے لوگوں کا کیا کرایا دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت جائیگا۔ اور یہ لوگ دوزخی ہیں اور وہ دوزخ میں رہ پڑیں گے۔ ایسا ہی دوسری جگہ فرماتا ہے من یرتد منکم عن دینہ۔ جس آیت کو مَیں آگے چلکر بیان کرونگا۔ اس کے علاوہ کئی جگہ فرماتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو ایمان کے بعد پھر کافر ہو گئے۔ جیسا کہ ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا۔ بلکہ ایک جگہ دو دو دفعہ کے ارتداد کا ذکر ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ ان الذین اٰمنوا ثم کفروا ثم اٰمنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا (النساء - ۱۳۷) یعنی جو لوگ ایمان لائے پھر کافر

ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے۔ اور پھر کفر میں بڑھتے گئے تو خدا نہ تو ان کی مغفرت ہی کریگا اور نہ انکو راہ راست ہی دکھائیگا۔ اب ان کھلی کھلی آیات کے ہوتے ہوئے ابوسفیان والی حدیث سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کبھی کوئی شخص مرتد نہیں ہوا تھا سراسر غلط ہے۔ ہاں النادر کالمعدوم کی مثل کو مدنظر رکھکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص مرتد نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ قرآن شریف کی صریح آیات کی تکذیب کرنا مومن کا کام نہیں اور پھر ان آیات کی مویدہ احادیث بھی ہیں جن سے بعض لوگوں کا مرتد ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر چونکہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ مثلاً ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ میں صرف معدودے چند اشخاص کا ارتداد ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ارتداد کچھ بھی قابل توجہ نہیں۔ اور ایسا ہی سلسلہ احمدیہ میں دو تین لاکھ کی جماعت میں پندرہ بیس اشخاص کا ارتداد ہرگز قابل توجہ نہیں ہے۔ ہاں خود ڈاکٹر عبدالحکیم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سیکڑوں لوگ بیعت میں داخل ہوکر اور صحبت کے نتائج دیکھکر منحرف ہوتے رہے ہے مثلاً منشی الٰہی بخش صاحب اکاؤنٹنٹ و منشی عبدالحق صاحب اکاؤنٹنٹ و حافظ محمد یوسف صاحب و صوفی عباس علی صاحب میاں فتح خاں محمد سعید خان وغیرہ" اب ڈاکٹر صاحب کو جسقدر اس سلسلہ سے واقفیت ہے وہ خود انکے اس بیان سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ بیعت میں داخل ہوکر مرتد ہوئے حالانکہ ان میں سے اول الذکر تین شخصوں نے کبھی بھی بیعت نہیں کی۔ پس سیکڑوں کی کیفیت تو ان چھ ناموں سے ہی معلوم ہوگئی جن میں سے تین کبھی اس پاک سلسلہ میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ پس جن لوگوں نے اس سلسلہ میں داخل ہوکر اسی قدر واقفیت حاصل کی ہو اور صحبت کا یہ حال ہو کہ گذشتہ چھ سات سال میں صرف ایک دو دفعہ اپنے امام کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں اور وہ بھی فیض صحبت سے متمتع ہونیکی غرض سے نہیں بلکہ فخریہ اپنی تفسیر کو سنانیکے لیے۔ انکے مرتد ہونے پر کیا افسوس ہو سکتا ہے۔

ہرقل والی حدیث پر بھی اگر غور کیا جاتا تو ہمارے علماء یہ ٹھوکر نہ کھاتے کہ ایک شخص کے ارتداد کو سلسلہ کے باطل ہونیکی دلیل بیان کرتے جس کو اگر دلیل مان لیا جائے تو نعوذ باللہ کل انبیاء علیہم السلام کا بطلان لازم آتا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ قال فھل یرتد احد منھم سخطۃ لدینہ بعد ان یدخل فیہ قلت لا۔ یعنی ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ کیا نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں میں سے کوئی پورے طور پر دین میں داخل ہوکر پھر اس دین سے بیزار ہوکر پھر بھی جاتا ہے تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ نہیں۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ سوال صرف یہ نہیں کہ کوئی مرتد ہوتا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اہل کتاب میں سے ہوکر ہرقل خوب جانتا تھا کہ ارتداد بھی ہر ایک الٰہی سلسلے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ باوجود اس علم کے جو اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے حاصل تھا اس بات کی وہ خبر نہ رکھتا ہو کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے پیروؤں میں سے بھی بہت لوگ مرتد ہوگئے تھے۔ پس ایسے علم کے ہوتے ہوئے ایسا سوال لغو تھا کہ وہ صرف یہ پوچھتا کہ کوئی شخص مرتد بھی ہوتا ہے کہ نہیں۔ اور حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اتنا سوال کیا بھی نہیں بلکہ اس کا سوال یہ تھا ھل یرتد احد منھم سخطۃ لدینہ

بعد ان یدخل فیہ۔ یعنی کوئی شخص کامل طور پر اس دین میں داخل ہو کر اس کے بعد پھر اس دین سے بیزار ہو کر مرتد ہوتا ہے یا نہیں۔ جسکا جواب ابو سفیان نے دیا کہ ایسا نہیں ہوتا۔ اب اس سوال میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ ایک شخص پورے طور پر دین اسلام میں داخل ہو چکا ہو۔ جس کے لیے الفاظ بعد ان یدخل فیہ آئے ہیں۔ اس کے معنے صرف داخل ہونے کے نہیں اور اگر ہمارے مولوی صاحبان نہ مانیں تو مَیں ہرقل کے الفاظ ہی جن میں اس نے ان الفاظ کی تشریح کی ہے پیش کروں گا۔ کیونکہ سوال و جواب کے بعد جب ہرقل نے استدلال شروع کیا تو اس سوال کے موقع پر پہنچکر وہ کہتا ہے۔ وسالتك ایرتد احد سخطة لدینہ بعد ان یدخل فیہ فذکرت ان لا وکذلك الایمان حین یخالط بشاشة القلوب۔ اب اسجگہ بعد ان یدخل فیہ کی ہرقل نے یہ تشریح کی ہے کہ کذلك الایمان حین یخالط بشاشة القلوب۔ یعنی ایمان جب بشاشت قلب کے ساتھ اختلاط پیدا کر لے یا بالفاظ دیگر انسان کو شرح صدر عطا ہو جائے۔ اور ایمان دل میں داخل ہو جائے تو پھر ارتداد نہیں ہوتا۔ اب خالی مان لینا تو ایسا بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا۔ قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ یعنی عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ پس ایمان جب تک دل میں داخل نہ ہو اور شرح صدر عطا نہ ہو وہ کسی کام کا نہیں۔ اسی واسطے قرآن شریف یہ بھی فرماتا ہے یاایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہ ورسولہ۔

پس اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں کہ کوئی شخص بھی مرتد نہیں ہوتا بلکہ ایسا شخص جس کے دل میں نور ایمان داخل ہو چکا ہے اور دل سے تمام تاریکیوں کو دور کر چکا ہے اور اسے نبی کے متعلق انشراح صدر عطا ہو چکا ہے۔ وہ مرتد نہیں ہوتا۔ اب اگر اس کسوٹی پر عبد الحکیم خاں کو پرکھا جائے تو وہ پورا نہیں اُتر سکتا۔ یہ کوئی بناوٹی بات نہیں ہے بلکہ جس دن لاہور میں اسکا لیکچر ہوا ہے جس میں اس نے سخت استہزاء اور بدزبانی سے اس سلسلہ کا ذکر کیا تو اس دن میرے ایک دوست نے جس نے یہ لیکچر خود اپنے کانوں سے سنا تھا یہ لفظ مجھکو لکھے کہ اس کا لیکچر سنکر مَیں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ شخص ایک لمحہ کے لیے بھی حضرت مسیح موعودؑ کا مرید نہیں ہوا۔ اور ایک شخص پر کیا منحصر ہے جو شخص اس کے اعتراضات کو پڑھیگا وہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ شخص فی الواقع کبھی مرید تھا اور سچے دل سے حضرت مرزا صاحب کو مسیح موعود اور مہدی مانتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اسکے دل کا گند بہت سالوں کے بعد نکلا ہے مگر بہت مدت تک پڑا رہنے نے اس کے دلکو اور بھی تاریک کر دیا ہے۔ مثلاً یہ اعتراض کرنا کہ براہین احمدیہ کا روپیہ کھا گئے اور وہ وعدہ پورا نہیں کیا اور وہ دوسرے امور پیش کرنا جس کا نام وہ بدعہدیاں رکھتا ہے ایسی باتیں نہیں ہیں کہ آج پیدا ہوئی ہوں اور بہ سبب نئی باتیں ہونے کے اس کے ایمان کو متزلزل کر دیا ہو بلکہ یہی اعتراض آج سے پندرہ سال پہلے لوگوں نے کئے۔ پس اگر اس کے نزدیک

یہ اعتراض صحیح ہیں اور ان سے حضرت مرزا صاحب کے دعوے کا بطلان ہوتا ہے تو ضرور ہے کہ یہی بات اس کے دل میں آج سے پندرہ سال پہلے ہو پس یہ چھپا ہوا گند جو مدت سے اس کے اندر سڑتا چلا آتا تھا نور ایمان کو دل میں داخل نہ ہونے دے سکتا تھا۔ اور ایسا ہی جسقدر اعتراض اس نے کئے ہیں وہ سب پرانے اعتراض ہیں پس ایک ایسے شخص کا ارتداد بعد ان یدخل فیہ کے نیچے نہیں آتا اور اس لیے سُنت انبیاءؑ سے خارج نہیں بلکہ عین اسی سُنت کے مطابق ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اُس نے کتابوں میں تائید بھی کی ہے تو یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ آیا یہ اعتراض جو آج عبدالحکیم کرتا ہے پہلے بھی موجود تھے یا نہیں اور انہیں اعتراضوں پر وہ بارہا اس سلسلہ کی تحریروں میں اور اخبار میں بحث پڑھ چکا ہے یا نہیں۔ پس اُسوقت اگر اسکا دل اطمینان پکڑ گیا تھا تو انہی وجوہ سے اب کیوں اطمینان نہیں پکڑتا۔ بالفاظ دیگر یہ مرض باوجود تائیدی مضامین لکھنے کے اس کے دل میں پہلے سے موجود تھا فزادھم اللہ مرضا۔ اور اس کی نظیریں پہلے انبیاءؑ میں موجود ہیں۔ کیا یہودا اسکریوطی جو بارہ حواریوں میں شامل کر لیا گیا تھا اور جسپر حضرت مسیحؑ کو اس قدر اعتبار تھا کہ وہ خزانچی بنا دیا گیا تھا مرتد نہیں ہوا۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ جب حواریوں میں شامل کیا گیا تو انکی طرح ارتداد سے پہلے وہ دوسرے لوگوں کو حضرت مسیحؑ پر ایمان لانیکے لیے وعظ بھی کیا کرتا تھا۔ ایسا ہی عبداللہ بن ابی سرح وحی کا کاتب ہونیکے باوجود مرتد ہوا۔ اور عبید اللہ بن جحش باوجودیکہ اس نے ہجرت بھی کی اور حبشہ میں چلا گیا تھا مرتد ہوا۔ ایسا ہی حضرت موسیٰؑ کے وقت میں ایسے ایسے لوگ مرتد ہوئے مگر سچی بات یہی ہے کہ اُن لوگوں کے دلوں میں نور ایمان داخل ہی نہیں ہوا تھا۔

دوسری بات جو اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہرقل کا سوال یہ تھا کہ دین سے بیزاری کی وجہ سے کوئی شخص مرتد ہوا یعنی اس تعلیم سے بیزار ہوکر مرتد ہو جو مامور دیتا ہے۔ سو عبدالحکیم خاں کی حالت میں ایسا بھی نہیں ہوا۔ حضرت مرزا صاحب کی خاص تعلیم تو حیات مسیح کے شرک کو دور کرنا ہے اور دوسری خاص تعلیم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے مکالمہ و مخاطبہ کا دروازہ کھلا ہے ان دونوں باتوں سے ڈاکٹر صاحب بیزار نہیں ہوئے اور نہ ہی یہ تعلیم انکی ٹھوکر کا باعث ہوئی ہے بلکہ ابتدائی خطوں میں تو وہ یہی کہتا تھا کہ جماعت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ اور مکالمہ مخاطبہ کے دروازے کے کھلا ہونیکا تو یہاں تک قائل ہے کہ خود مدعی الہام بھی ہے۔ اس کے اعتراضات جو کچھ ہیں وہ تعلیم پر نہیں بلکہ حضرت مرزا صاحب کی ذات پر یا جماعت کے افراد پر ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ مرزا صاحب کو جھوٹا کہتا ہے اور اس لئے اسکا ارتداد سخطۃ لدینہ ہے تو یہ محض فضول ہے کیونکہ اگر ان الفاظ سے یہی مراد لی جائے تو پھر ارتداد ہی بے معنی ہوتا ہے۔ مرتد ہونیکے تو معنے ہی یہ ہیں کہ مدعی کو جھوٹا کہا جاوے اگر یہودا اسکریوطی مسیحؑ کو منجانب اللہ مانتا تو کیوں مرتد ہوتا اور تیس روپیوں کے بدلے پکڑوا تا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ایک آدمی ایک سچی بات کی حقیقت کو بخوبی سمجھ لیتا ہے تو وہ اسپر صدق دل سے قائم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ

اسے سچی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جھوٹ کی حقیقت پر جب انسان اطلاع پاتا ہے۔ تو پھر وہ اس سے بیزار ہو جاتا ہے اور اس کو ترک کر دیتا ہے۔ پس ایک صادق کے ساتھ جسقدر گہرا تعلق انسان پیدا کرتا جائیگا اسیقدر اسکی محبت اور اخلاص بھی ترقی کرتے جاویں گے اور کاذب کے ساتھ گہرا تعلق پیدا کر کے اسکا کذب معلوم ہو جائیگا۔ پس دیکھنا چاہیئے کہ اکثر ان لوگوں سے جو ایک گہرا تعلق پیدا کرتے ہیں ایسے ہیں جو دن بدن ایمان اور اخلاص میں ترقی کرتے اور اپنے مالوں اور جانوں کو فدا کرتے ہیں۔ یا اس سے بیزار ہو کر اسکا ساتھ چھوڑتے ہیں۔ ایک عبدالحکیم خان کیا چیز ہے ہزاروں انسان جو حضرت مسیح موعودؑ کے فیض سے متمتع ہونیوالے ہیں اور جنہوں نے آپ سے گہرا تعلق پیدا کیا ہے وہ ایمان اور اخلاص میں ترقی کر رہے ہیں اور کوئی بات انکے ایمان کو ہلا نہیں سکتی۔ بلکہ اس جماعت کی ایمانی قوت ہی اسکی ٹھوکر کا باعث ہوئی ہے اور جسکو وہ غلو قرار دیتا ہے وہ اس جماعت کا سچا اخلاص اور جانفشانی ہے جو ماموریں کے ساتھ رہنے والوں میں لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور اُسی قسم کی جانفشانی اور اخلاص ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات میں دیکھا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اس کے اپنے دل میں کمزوری تھی اور اخلاص اور محبت سے اسکا دل خالی تھا اس لیے اسکو سچا جوش اور اخلاص بھی اس جماعت کا بُرا معلوم ہوا۔ صد افسوس کہ وہ امر جو حضرت مسیح موعودؑ کی صداقت کا بیّن ثبوت تھا اسی پر اس شخص نے ٹھوکر کھائی۔

اگر یہ سوال کیا جاوے کہ جھوٹے اور سچے میں پھر کیا فرق ہے تو اسکا جواب نہایت صاف ہے۔ جھوٹا مدعیٔ نبوت یا تو پہلے ہی سرسبز نہیں ہوتا اور ناکام و نامراد مرجاتا ہے یا اگر ابتدا میں کچھ لوگ اس کے ساتھ شامل بھی ہوں تو وہ سلسلہ جلدی سی تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کی نظیریں گذشتہ زمانے کو چھوڑ کر خود اس زمانے میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ مثلاً ایک طرف چراغ الدین ساکن جموں کی حالت پر غور کرو کہ اس نے سلسلہ احمدیہ سے مرتد ہو کر یہ دعویٰ کیا کہ مَیں صلح کا رسول ہوں اور اسلام اور عیسائیت میں صلح کرانیکے لیے بھیجا گیا ہوں مگر خدائے تعالیٰ نے اسے فی الفور ہی ہلاک کر کے اس کا نام و نشان مٹا دیا۔ دوسری طرف ڈوئی مدعیٔ نبوت ملک امریکہ کا ہے۔ جس نے الیاس ہونیکا دعویٰ کیا ابتدا میں بہت سے لوگ اس کے ساتھ مل گئے جسطرح مسیلمہ کذاب کے ساتھ ملگئے تھے مگر تھوڑے ہی سالوں میں اس کے کل افترا کی حقیقت طشت از بام ہو گئی۔ اور جگہ جگہ مریدین نے اسکا ساتھ چھوڑ دیا اور اسے مفتری اور کاذب اور خائن ثابت کیا۔ اور اس شہر سے جو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا اسے نکال دیا۔ اور انجام کار وہ بہت ہی خائب و خاسر اور ناکام اور ذلیل ہوا۔ مگر سچے کو اللہ تعالیٰ کبھی ضایع نہیں کرتا اور ہر قسم کی ابتلاؤں کی آندھیوں کے درمیان وہ محفوظ رہتا ہے۔ اسکی جماعت میں سے بھی بعض بد نصیب مرتد بھی ہو جاتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مرتد ہو کر اس سلسلہ کو نیست و نابود کر دینگے اور لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روک دیں گے اس کی ترقی بند ہو جائیگی اور جو لوگ داخل ہو چکے ہیں وہ بھی نکل جائیں گے۔ مگر وہ جلد خود ہی ... ناکامی کا مزہ چکھ کر اس دنیا سے حسرت لیے اُٹھ جاتے ہیں۔ اور الٰہی سلسلہ اسیطرح

سرسبز رہتا بلکہ آگے سے بھی زیادہ ترقی کرتا ہے۔ اور فوج در فوج لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کی نصرتیں اور تائیدیں اس کے شامل حال ہوتی ہیں۔ اس قانون الٰہی کو قرآن شریف ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ یٰایّھا الذین اٰمنوا من یرتدّ منکم عن دینہٖ فسوف یأتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اذلّۃٍ علی المؤمنین اعزّۃٍ علی الکٰفرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائمٍ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ واسع علیم..... ومن یتول اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغٰلبون۔ (المائدہ۔۵۴) اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے (خدا کو اس کی ذرہ بھی پروا نہیں) تو جلد خدا (اس ایک کی بجائے) ایک ایسی قوم لا موجود کریگا جن کو وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اسکو دوست رکھنے ہوں گے مسلمانوں کے ساتھ نرم کافروں کے ساتھ کڑے اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت کا کچھ خوف نہیں رکھیں گے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسکو چاہے دے اور اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے اور وہ سب کے حال سے واقف ہے..... اور جو اللہ اور اللہ کے رسول اور ایمان والوں کا دوست ہو کر رہیگا وہ جان لے کہ آخر کار اللہ کا گروہ ہی غالب ہوگا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ماموریت کے خدا کیطرف سے ہونیکا یہ نشان ہے کہ ایسا سلسلہ کسی کی کوششوں سے تباہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی آدمی مرتد بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی بجائے اور بہتیروں کو اس سلسلے میں داخل کرتا ہے جو صدق دل سے ماننے والے ہوں۔ اور کسی کی ملامت سے ڈر کر اس سلسلے کو نہ چھوڑیں وہ مومنین کے ساتھ نرم اور کافروں کے مقابل سخت ہوں گے۔ ان آیات سے مرتدین کے دلوں کی حالت کا بھی اندازہ لگتا ہے۔ گویا وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ کافروں کے مقابل سخت اور مومنین کے ساتھ نرم نہیں ہوتے اور ملامت کرنیوالوں کے ڈر سے بھی ڈر کر انکار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالحکیم کی حالت پر غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفات مرتدین کے اس میں پائے جاتے ہیں جیسا کہ اسکی بعض اپنی تحریروں اور اس کے دوستوں کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ اس جماعت کے مومنین کے ساتھ تو اس نے سخت سلوک کیا اور ناحق ان کو برا بھلا کہا اور ان لوگوں کے ساتھ ملا جو سخت معاند تھے۔ پس یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ الٰہی سلسلے کا یہ بڑا بھاری نشان ہے کہ وہ ہر طرح کی مخالفتوں پر غالب آتا ہے۔ کوئی مخالف اسکا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ جو کوئی اس سے بگڑتا ہے وہ خود نقصان اٹھاتا ہے۔ اب ڈاکٹر عبدالحکیم خاں نے بھی مخالفت پر پورا زور لگایا ہے مگر کیا اس کی مخالفت سے اس سلسلہ کا کچھ بگڑا؟ یا ترقی رک گئی؟ وہ سوچے کہ کسقدر مریدین مخلصین پر اس کی گندی اور سب و شتم سے بھری ہوئی تحریروں کا اثر ہوا اور اگر ابھی اسے کچھ امید باقی ہے تو چاہیئے کہ پورا زور لگالے اور تمام ولولے دل کے نکال لے پھر دیکھے گا کہ اس کی مخالفت نے اس سلسلے کو فائدہ دیا ہے یا نقصان۔ اگر وہ ذرا بھی تدبر سے کام لے تو اب بھی وہ دیکھ سکتا ہے کہ اسکی مخالفت اس الٰہی سلسلہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ خدا اسکو غالب کرتا رہے

اور غالب کر کے دکھاوے گا اور ایسے مرتدین یا مخالفین کے تمام اعتراضوں کا جواب اسی سنت کے مطابق دیگا جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اس کی سنت رہی ہے۔ یعنی آخر کار اس سلسلہ کو ہر طرح سے غالب کریگا اور مخالفین اور مرتدین اور منافقین کو ناکام اور نامراد کریگا۔

افسوس ان مخالفین پر ہے جنہوں نے اندھوں کی طرح بلا سوچے سمجھے ڈاکٹر عبدالحکیم خاں کی تائید کی ہے حالانکہ جن اصول پر اسکا ارتداد مبنی ہے وہ ایسے ہیں کہ اسلام سے بھی وہ خارج ہے اور اگر انہیں اصول پر قائم رہا تو آج نہیں تو کل کھلم کھلا اسلام کی بھی مخالفت کرے گا۔ مجھے رنج پیدا ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان کہلانے والے ایڈیٹران اخبار ڈاکٹر عبدالحکیم خاں کے ان خیالات کو شایع کر رہے ہیں جن کی زد خالی حضرت مرزا صاحب پر نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ قرآن شریف پر۔ اسلام پر۔ بلکہ خدا کے کل نبیوں پر ہے یہ میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ اس وجہ سے اسکے خیالات کو شایع نہیں کر رہے کہ انہیں انکے ساتھ اتفاق ہے بلکہ یہ صرف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بغض کی وجہ سے ہے۔ افسوس کہ ان لوگوں نے حضرت مرزا صاحب کی مخالفت میں اسلام کی عزت کا بھی پاس نہ کیا۔ اور محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کا پاس بھی نہ کیا۔ اور تمام مسلمان کہلانیوالے اخبارات میں سے صرف ایک شخص نے دبی زبان سے اقرار کیا کہ جس خیال پر عبدالحکیم خاں کا ارتداد مبنی ہے وہ خلاف مذہب جمہور اہل اسلام ہے۔ خلاف جمہور تو جو ہوا سو ہوا مگر یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر حملہ ہے کہ مسلمان ہو کر یہ لفظ مونہہ سے نکالے کہ آنحضرتؐ کی پیروی نجات کے لئے ضروری نہیں۔ کسقدر ظلم ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا یہ لکھتا ہے کہ بغیر متابعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بغیر قرآن شریف پر عمل کرنے کے نجات ہے۔ اور اسوجہ پر وہ سلسلہ احمدیہ سے مرتد ہوتا ہے کہ اسے کسی امام یا مامور کی پیروی کی ضرورت نہیں اور اس کے خیالات کو بغیر تردید وہ اخبار شایع کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے مذہب کے بڑے مؤید کہلاتے ہیں اور جن میں دن رات یہ شور مچایا جاتا ہے کہ جبتک ان اخبارات کو خریدا نہ جاویگا تب تک مسلمان اسلام پر قائم نہیں رہ سکتے۔ کیا یہ طریق مسلمانوں کو اسلام سے متزلزل کریگا ہے یا اکھڑے ہوؤں کو قائم کریگا؟

میں اس بحث کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی اس رسالہ میں زیادہ گنجایش ہے۔ ایک بات کی طرف میں ان اخبار نویسوں کو توجہ دلاتا ہوں۔ عبدالحکیم خان نے چند ماہ ہوئے ہیں ایک ترجمہ انگریزی میں قرآن شریف کا شایع کیا جس میں اس نے حضرت مسیح موعودؑ کے دعوے کی صداقت کو قرآن شریف اور حدیث صحیحہ سے ثابت کیا ہے۔ اور ان دلایل سے یہ قطعی نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت مرزا صاحب مسیح موعودؑ ہیں۔ لیکن مرتد ہوتے وقت ان دلایل میں سے ایک کو بھی نہیں توڑا۔ بلکہ چند اور باتیں پیش کی ہیں جو صرف مرزا صاحب کی ذات پر اعتراض ہیں۔ اور وہ باتیں آج وجود میں نہیں آئیں بلکہ اسوقت بھی موجود تھیں جب اس نے حضرت مرزا صاحب کا منجانب اللہ اور مسیح موعود ہو

ثابت کیا تھا۔ مثلاً براہین احمدیہ کے نہ چھپنے یا قیمتوں کے متعلق یا پریس کے چندے وغیرہ کے متعلق یہ کوئی تازہ امور پیدا نہیں ہوئے۔ ایسا ہی یہ اعتراض کہ مرزا صاحب کی صحبت میں اثر نہیں یا یہ کہ جب عبد الحکیم نے حضرت مرزا صاحب کو اپنی تفسیر سنائی تو آپ نے کوئی معارف اور حقایق بیان نہیں کیے اور نئے نکتے نہیں بتائے۔ اور سلیمان کے قصے پر روشنی نہیں ڈالی۔ یا یہ اعتراض کہ لنگرخانہ کے روپے کا باضابطہ حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ یا یہ اعتراض کہ مرزا صاحب مکان بنواتے ہیں یا مفرحات اور مقویات کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ باتیں آج ڈاکٹر صاحب کے علم میں نہیں آئیں بلکہ جسوقت اس نے اردو تفسیر میں حضرت مرزا صاحب کا مسیح موعود ہونا ثابت کیا تھا یا پھر جسوقت ابھی چند ہی ماہ ہوئے انگریزی ترجمہ میں ایسا ہی ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیا اسوقت یہ سب باتیں موجود تھیں اور خود اس جیسے سیاہ دل مخالف پہلے بھی ان باتوں پر اعتراض کر چکے تھے۔ پھر اگر یہ تمام امور اسوقت منافی مسیحیت نہیں تھے تو اب کیونکر ہو گئے۔ آخر جس طرز استدلال سے اب وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے اسکو بھی تو دنیا کے سامنے کھولکر بیان کرنا چاہیئے۔ مرزا صاحب کے الہامات انت منی وانا منک اور یحمدک اللہ من عرشہ یہ بھی پرانے الہام ہیں۔ پس ان تمام باتوں سے جو نتیجہ آج نکلتا ہے وہی پانچ یا دس برس پہلے نکلتا تھا۔ اب ہماری مخالف اخبار نویسوں کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ اگر ایک شخص نے مرزا صاحب کے متعلق یہ رویہ اختیار کیا ہے تو کل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہی رویہ وہ اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ آخر آنحضرتؐ پر بھی اعتراض کرنیوالے موجود ہیں۔ اور پیروی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اسکے نزدیک نجات کے لئے ضروری ہے ہی نہیں۔ اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نماز بھی باقاعدہ ادا نہیں کرتے۔ پس ایسے شخص کو مرزا صاحب کی مخالفت کی وجہ سے بڑھا بڑھا کر پیش کرنا عقلمندی کا کام نہیں ع مرادِ ما نصیحت بود کردیم۔

جو اعتراض اس بدنصیب مرتد نے بار بار حضرت مرزا صاحب پر کیے ہیں وہ ایسے ہی اعتراض ہیں جو آجتک عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے ہیں۔ مگر اسکو یاد رکھنا چاہیئے کہ سنت اللہ انبیاءؑ کے متعلق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام اعتراضوں کا جواب اپنے ایک ہی طاقتور ہاتھ سے دیا کرتا ہے۔ اور اپنی تائید اور نصرت اپنے مامور کے شامل حال کر کے تمام معترض مخالفوں کو نامراد کرتا ہے۔ مگر میں ڈاکٹر عبد الحکیم سے یہ پوچھتا ہوں کہ وہ دلایل جو اس نے تائید مسیح موعودؑ میں دیے ہیں وہ اب بھی صحیح ہیں یا غلط ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر میں پوچھتا ہوں کہ یہ دلیل جو ڈاکٹر مذکور نے اپنے ترجمہ میں دی ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب ۲۷ سال سے اپنے الہامات کو شایع کر رہے ہیں اور انکا سلسلہ روز بروز ترقی کرتا چلا جاتا ہے حالانکہ مفتری کے متعلق اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اسکو مخذول و مردود کرتا اور ہلاک کر دیتا ہے۔ اب جب ۲۷ کی بجائے ۲۸ سال اس دعوے پر گذر گئے تو اب یہ دلیل کیوں اسی مدعا کو ثابت نہیں کرتی۔ پھر یہ دلیل کہ قرآن شریف اور حدیث کی رو سے ماہ رمضان میں سورج اور چاند کا گرہن مقررہ تاریخوں پر مہدی کے ظہور کا نشان ہے۔ اب کیونکر اس پہلے مدعا کو ثابت کرنیسے قاصر ہے۔ ایسا ہی وہ ان تمام

دلایل کو پڑھکر جو پہلے دیکھا ہے اب اُنکا باطل ہونا ثابت کر دو تو ہم بھی مان لیں گے کہ واقعی جیسا وہ دعویٰ کرتا ہے اسکا مرزا صاحب کے سلسلہ سے مرتد ہونا نیک نیتی پر مبنی ہے ورنہ یہی کہنا پڑیگا کہ تفسیر اور ترجمہ کے بیچنے کے لئے یہ بھی ڈاکٹر صاحب نے ایک چال چلی ہے ایسا ہی جبتک وہ یہ ثابت نہ کرے کہ کیوں وہ اعتراضات جنکا اسے پہلے سے علم ہے آجتک اس مدعا کو ثابت نہ کرتے تھے جس کے ثبوت میں آج وہ انہیں پیش کرتا ہے تو لازماً ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ اسکی پہلی تحریریں بھی نفاق پر مبنی تھیں اور دل میں کچھ اور تھا اور لکھ کچھ اور رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ یقین کرنیکے وجوہات بھی ہونگی کہ یہی حالت اس کی ان تحریروں کی ہے جو وہ اسلام کی تائید میں لکھ رہا ہے۔ یعنی وہ بھی کسی ذاتی غرض پر مبنی ہیں۔

مَیں اسقدر لکھ چکا تھا کہ اخبار وطن ۵۔جولائی ۱۹۰۶ء میں مَیں نے بقیہ خط ڈاکٹر عبد الحکیم کا پڑھا۔ اسکو پڑھکر مَیں حیران ہوں کہ یہ شخص تو جوش مخالفت میں اندھا ہو ہی رہا تھا۔ اسکی خط وکتابت کو چھاپنے والے بھی اندھے ہو رہے ہیں۔ پھر وہی باتیں پیش کی ہیں جو آج سے پندرہ برس پہلے کی ہیں۔ مگر اس شخص کو ذرہ بھی شرم نہیں آتی کہ ابھی چار ماہ پیشتر تک تو وہ امام اور رسول اور مسیح لکھ رہا تھا۔ اب کس بیحیائی سے اسی پرانے علم کی بنیاد پر اسقدر گندی گالیاں لکھ رہا ہے۔ لوگوں کو دھوکا دینے کیلیے بار بار لکھتا ہے کہ کیا نبی ایسے ہی بدعہد اور شکم پرور تھے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ یہی باتیں انبیاء کے منکرین انکی نسبت کہتے ہیں کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے جیسے مجذوم القلب پادریوں نے معاذ اللہ نفس پرست شہوت پرست۔ زانی۔ لٹیرا ڈاکو نہیں کہا؟ اور پھر اقرار حلفی دیتا ہے کہ ان الزامات کو اگر رد کیا جائے تو وہ پانچسو روپیہ دیگا کیا تمہارے اقرار ونکا اب بھی کوئی اعتبار باقی رہ گیا ہے؟ یا تمنے عیسائیوں کو قائل کر دیا ہے کہ جو الزام وہ آنحضرتؐ پر لگاتے ہیں وہ درست نہیں ہیں یا عیسائیوں نے یہودیوں کو قائل کر دیا ہے کہ جو الزام وہ حضرت عیسیٰؑ پر لگاتے ہیں وہ درست نہیں ہیں؟ پھر لکھتا ہے کہ ۳۱۳ ناموں والی فہرست صحیح نہ تھی لیکن مَیں پوچھتا ہوں کہ اگر صحیح نہ تھی تو تم نے خود کیوں اسکو اپنے انگریزی ترجمہ قرآن شریف میں بطور صداقت مسیح موعود لکھا؟ کیا تم ایمانداری سے کہہ سکتے ہو کہ پہلے علم کی نسبت آج تمکو کوئی زیادہ علم حاصل ہو گیا ہے جسکو تم یقینی طور پر صحیح کہہ سکتے ہو اگر نہیں تو ان سب باتوں کا جواب لعنۃ اللہ علی الکاذبین ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ مرزا صاحب تو گالیاں نکالتے ہیں کیا ہم انکی پیروی کرکے لوگوں کو گالیاں نکالیں۔ اگر یہ گالیاں ہیں تو پھر تم کل کو قرآن شریف کو بھی جواب دوگے۔ اور اس ”فحش گوئی“ کے باوجود تم آجتک کیوں مرید رہے۔ کیا تم نے آج ہی حضرت مرزا صاحب کی کتابوں کو پڑھا ہے؟۔ کیا مرزا صاحب تمکو کہتے ہیں کہ تم لوگوں کو گالیاں نکالا کرو۔ اور اگر مرزا صاحب کی تحریروں کی ورق گردانی کرکے جہاں کوئی سخت الفاظ استعمال ہوئے ہیں انکو اکٹھے کرکے تم انکی تعلیم بناتے ہو تو قرآن شریف سے بھی ایسے سخت الفاظ اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ قردۃ۔ خنازیر۔ عبد الطاغوت۔ اخوان الشیاطین۔ انعام۔ حمار۔ علیہم لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین۔ ضال۔ مغضوب۔ مہین۔ عتل۔ زنیم۔ مگر یاد رکھو کہ ان باتوں سے تم سلسلہ احمدیہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے نہ ہی آجتک تمہارے جیسے معترضوں نے

# جاپان میں اسلام

۳۔جولائی ۱۹۰۶ء کے سول میں جو لنڈن کے نامہ نگار کی چٹھی چھپی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کی رائے کا رجحان مذہب اسلام کو اختیار کرنیکا ہے۔ راقم خط لکھتا ہے "ایک جرمن کے اخبار میں یہ مضمون چھپا ہے کہ وہ مذہبی کانفرنس جو شاہ جاپان نے منعقد کی ہے اسلام کے جاپان کا شاہی مذہب بنایا جانیکی سفارش کریگی۔ انگریزی اخباروں میں اسکے متعلق ابھی کوئی رائے زنی نہیں ہوئی لیکن عام خیال اس ملک میں یہ ہے کہ خواہ کانفرنس کسی مذہب کے اختیار کرنیکی سفارش کرے بہرحال شاہ جاپان اور اسکے مشیروں کے ارادے پر اسوقت کوئی بحث کرنا قبل از وقت ہے۔ جرمن اخبار محولہ بالا کا یہ بیان ہے کہ جاپانی حکومت اپنے دل میں یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ آنحضرتؐ کا مذہب قبول کرنیسے اسے ملکی فوائد بھی بہت سے پہنچیں گے۔ جاپان ایشیا میں ملکی طور پر جن آرزوؤں کے حاصل کرنیکا خیال رکھتا ہے انکو وہ اسلام کے ساتھ تعلق پیدا کرکے آسانی سے حاصل کر سکتا ہے اور جاپان کے مسلمان ہونے سے اسلام میں ایک نئی روح پیدا ہو جائیگی لیکن ان خیالات پر غالباً "زرد خطرہ" کا قابوس دباؤ ڈال رہا ہے۔ اور محض ملکی وجوہات سے جاپان کے مذہب اسلام اختیار کرنیکا جو وہ یقین ظاہر کرتا ہے وہ چنداں قابل اعتبار نہیں۔ جاپانی گورنمنٹ کے سامنے یہ سوال کہ کسی مذہب کو ملک کا شاہی مذہب بناکر اختیار کیا جاوے مدت دراز سے ہے لیکن اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ اس کے متعلق گورنمنٹ اسقدر جلدی فیصلہ کرنیکو تیار ہے۔ ایک وقت میں یہ خیال تھا کہ جاپان مغربی طریق کی پیروی کو مغربی مذہب یعنی عیسویت اختیار کرکے کامل طور پر اپنے اندر لے لیگا۔ لیکن آج سے چند سال پہلے اگر اس کی کچھ امید بھی تھی تو جنگ روس و جاپان نے اس امید کو قطع کر دیا ہے اور بحیثیت ایک غیر عیسائی طاقت ہونیکے جو کارنامے جاپان نے میدان جنگ اور ملکی تدابیر میں دکھائے ہیں انکی وجہ سے یہ خیال کہ جاپان عیسائی مذہب کو اختیار کرے باقی نہیں رہا۔ عیسائی پادریوں کو اب نہ تو کوئی امید ہی باقی ہے اور نہ انکے دل میں یہ خواہش ہی رہ گئی ہے کہ جاپان عیسائیت کو شاہی مذہب بنالے (کیونکہ وہ اس سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں) تاہم انکو طبعاً سخت صدمہ پہنچیگا اگر جاپان کے مذہب اسلام اختیار کرنے کی نسبت یہ بیان صحیح ثابت ہوا"۔

عیسائیوں کو صدمہ پہنچے یا کچھ ہو اسلام کے غالب ہونیکا وقت آگیا ہے اور نہ صرف جاپانی بلکہ خود یورپ اور امریکہ کے سمجھدار لوگ عنقریب دیکھ لیں گے۔ کہ صداقت سوائے اسلام کے کہیں نہیں۔ اور وہ دن آتا ہے جو یورپ اور امریکہ کے صلیب پرست شہروں میں اللہ اکبر کی آواز بلند ہو۔

## فہرست خریداردہندگان انگریزی بابت ماہ اپریل ۱۹۰۶ء

منشی میر اکبر صاحب مردان -۱- شیخ غلام احمد صاحب دھرمکوٹی بھوپال -۱- منشی صادق حسین صاحب مختار اٹاوہ -۱
شیخ مظفر الدین صاحب کوہاٹ -۱- مرزا محمد احسن بیگ صاحب قادیان دارالامان -۱- مرزا خدا بخش صاحب -۱
حافظ عبد العلی صاحب بی-اے- سرگودہا -۱- بابو محمد منظور الٰہی صاحب بٹھنڈہ -۱- میاں الٰہی بخش صاحب جمعدار کوٹلہ کھلانا -۱

## فہرست خریداردہندگان اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۰۶ء

بابو محمد منظور الٰہی صاحب بٹھنڈہ -۹- منشی غلام نبی صاحب مدرس بہلوال -۲- شیخ محمد یوسف صاحب انبالہ -۲-
چودھری رستم علی صاحب شہر انبالہ -۳- منشی میر اکبر صاحب مردان -۳- منشی عطا محمد صاحب خانپور -۲- منشی عطا محمد صاحب
تراب احمدی چودھریوالہ -۲- مولوی ابو محمد عبد اللہ صاحب کھیوہ باجوہ -۲- بابو فیروز علی صاحب بمقام سیالکوٹ -۲- ملک غلام احمد
صاحب دوکاندار بندہ پور -۲- ڈاکٹر عباد اللہ صاحب امرتسر -۲- میاں عبد الوہاب صاحب حسن پور -۲- ڈاکٹر نعمت خانصاحب
پشاور -۲- مولوی غلام امام صاحب عزیز الواعظین منی پور -۲- منشی حبیب الرحمٰن صاحب رئیس حاجی پور -۱- منشی نبی بخش صاحب
سررشتہ دار لاہور -۱- بابو عمر الدین صاحب شملہ -۱- بابو غلام دستگیر صاحب لاہور -۱- شیخ محمد رمضان و محمد سلطان از لودھران -۱
میاں عبد اللہ صاحب تیماپور -۱- بابو غلام حسن صاحب سانگلہ ہل -۱- شیخ مظفر الدین صاحب کوہاٹ -۱- مستری حسن دین صاحب
راولپنڈی -۱- میاں عبد الرحیم صاحب کنسٹبل فرخ آباد -۱- شادیخاں صاحب قادیان -۱- محمد سلطان صاحب پشاور -۱-
شیخ علی بخش صاحب تندپور -۱- شیخ محمد امین صاحب لاہور -۱- مولوی عبد الحق صاحب سیدوالہ -۱- پیر سراج الحق صاحب سادہ -۱
منشی حامد حسن خانصاحب میرٹھ -۱- منشی پیر محمد صاحب پارہ چنار -۱- منشی ہاشم علی صاحب سردولگڈھ -۱- منشی فتح محمد صاحب
رام بن -۱- منشی علی احمد صاحب لکی -۱- چودھری شجاول خانصاحب جگراؤں -۱- محمد عبد اللہ صاحب بھینی -۱- منشی احمد علی صاحب کیمپ کہکہ -۱

## فہرست چندہ اعانت دہندگان بابت ماہ اپریل ۱۹۰۶ء

جماعت سیالکوٹ معرفت ماسٹر غلام محمد صاحب -جماعت لاہور معرفت حکیم محمد حسین صاحب قریشی- للعہ ۱۵ ۶ پائی ماہوار- میاں عطا محمد
صاحب حکیم بریسیاں ضلع جالندھر- عہ ۲۵ -جماعت لدھیانہ معرفت قاضی خواجہ علی صاحب- عہ ۱۶ چودھری رستم علی صاحب انبالہ عہ ۱۰
شیخ محمد وزیر الدین خانصاحب گوجرخان- عہ ۱۰ شیخ نور احمد صاحب ایبٹ آباد للعہ ۱۲ -جماعت پٹیالہ معرفت حافظ نور محمد صاحب ۸ ۱۲
میاں عبد العزیز صاحب لاہور- لعہ ۹ -میاں احمد الدین صاحب کمپونڈر تربت جیدری- معہ -مرزا سلطان احمد صاحب افسر مال میانوالی- معہ
ڈاکٹر بشارت احمد صاحب پنڈی گھیپ- معہ والدہ چودھری نواب خانصاحب سفید پوش سکنہ بہرام- سے منشی عبد الوحید صاحب
سنصر مہیار تھل- صمہ شیخ اسد دین صاحب شملہ للعہ -مرزا عبد العزیز بیگ صاحب قصور للعہ -منشی دین محمد صاحب روپڑ للعہ -منشی
محمد رمضان صاحب انبالہ للعہ -ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب ہانگ کانگ للعہ -سید احمد شاہ صاحب ڈیرہ اسمٰعیل خان للعہ -قاضی حسین بخش
صاحب زیرہ للعہ -جماعت بن باجوہ معرفت مولوی محمد علی صاحب مدرس للعہ -چودھری جلال الدین صاحب بی-اے گوجرخان
حسب تحریک منشی گلاب خاں صاحب راولپنڈی للعہ

اعلان:- ہر ایک سامان کرکٹ ٹینس فٹ بال جمنیسٹک وغیرہ مستری نظام الدین احمدی شہر سیالکوٹ سے مل سکتا ہے۔ مکمل فہرست مفت +